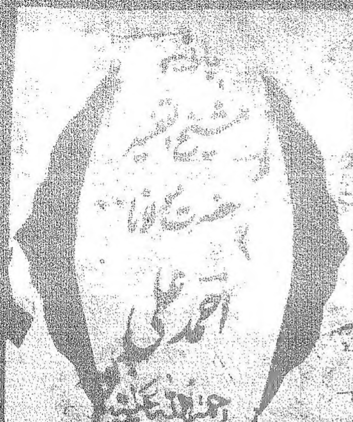
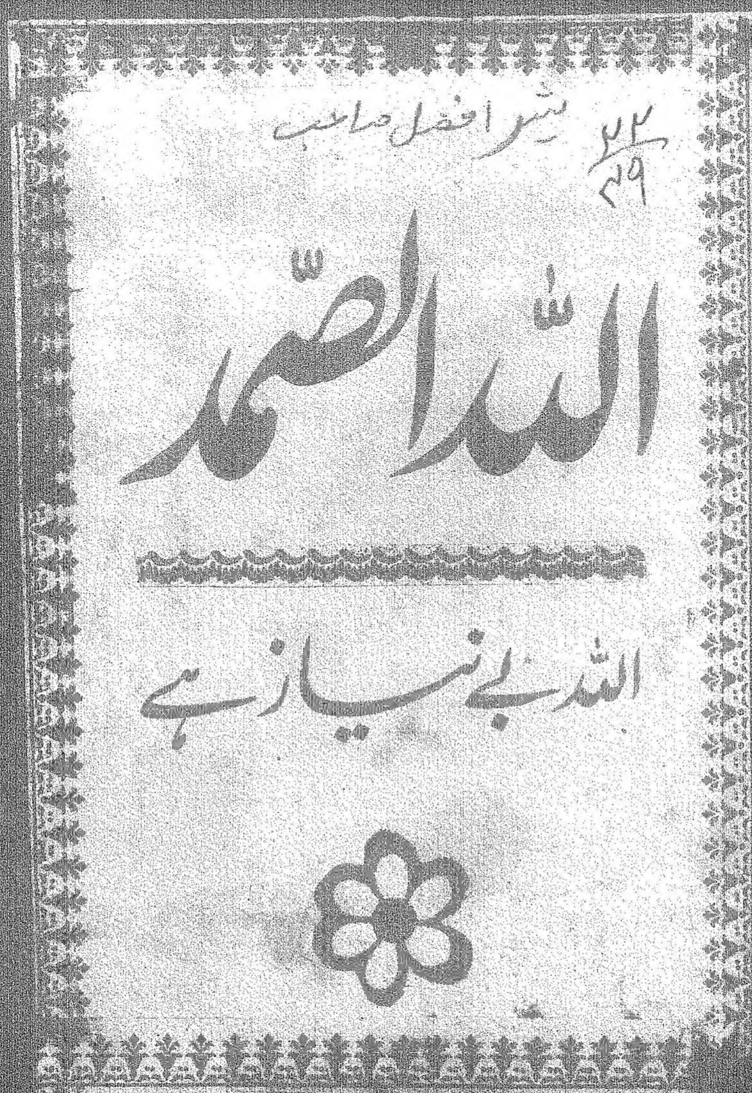
خدام الدین

لاہور





۲۹ر اپریل ۷۷ء
۱۰ جمادی الاول

احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جنّت اور دوزخ

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَتَدْرُوْنَ مَا اَکْثَرُ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ تَقْوَی اللّٰهِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ۔ اَتَدْرُوْنَ مَا اَکْثَرُ مَا یُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ اِلَّا الْجُوْفَانِ اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ لوگوں کو جنت میں پہنچانے والی چیزیں زیادہ تر کون سی ہیں۔ اللہ تعالےٰ سے ڈر کر پرہیزگاری اور سب کے ساتھ اچھا برتاؤ۔ کیا تم جانتے ہو کہ دوزخ میں لے جانے والی زیادہ تر فقط دو چیزیں ہیں منہ اور شرم گاہ۔

مرنا ضرور ہے۔ موت سے آج تک کوئی بچ نہیں سکا اور نہ آئندہ بچ سکتا ہے۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ موت یہاں کی مصیبتوں کا خاتمہ ہی ہو کر رہ جاتی ـــــ اور آگے کچھ نہ ہوتا۔ لیکن انسان کے پیدا کرنے والے نے صاف الفاظ میں قرآن مجید میں یہ کہہ دیا ہے کہ یہ مت سمجھ لینا کہ مرنے کے بعد کچھ نہ ہوگا۔ دنیا میں آنکھ بند ہونے ہی تم ایک اور عالم میں پہنچ جاؤ گے اور دنیا میں اچھے یا برے جیسے عمل کرو گے ان کی سزا یا جزا دوسری زندگی میں پاؤ گے۔ تمہیں ایک دن نئے سرے سے زندہ کیا جائے گا۔ اور وہاں تمہارے اعمال کا حساب ہوگا۔ جس کے اچھے عمل زیادہ ہوئے تو وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔ جہاں موت کا نام و نشان بھی نہ ہوگا۔ اور عیش و آرام کی زندگی ہمیشہ کے لیے میسّر ہوگی۔ اگر کہیں بدقسمتی سے کسی کے برے اعمال زیادہ ہوئے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جہاں اسے مرنا بھی نصیب نہ ہوگا۔ بلکہ ہمیشہ دُکھ بھری زندگی کاٹے گا اللہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ دوزخ سے نجات پانا اور جنت میں داخل ہونا جبھی نصیب ہوگا جب حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا کہنا مانو گے۔

دیکھو، اس حدیث میں کیا لکھا ہے۔ آپؐ کے ایک صحابی حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں پہنچانے والی زیادہ تر دو چیزیں ہیں۔ اللہ سے ڈر کر ان باتوں سے بچنا جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے اور وہ عادتیں اختیار کرنا جن کو اللہ نے انسان کے لیے اچھا بتایا ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ کہ دوزخ میں لے جانے والی زیادہ تر دو ہی چیزیں ہیں منہ اور شرمگاہ۔ منہ سے کفریہ کلمات نکالنا، غیبت کرنا، گالیاں دینا، فحش باتیں کرنا، دوسروں کو بہلا پھسلا کر برائی پر آمادہ کرنا، دوسروں کے دل دکھانے والے کلمے نکالنا، بہکانا، دھوکہ دینا، ذرا سی دیر میں آپس میں لڑائی کروا دینا اور جانے کیا کیا واہی تباہی بکواس ہوتی ہے نیز زبان کے چٹخارے بہت سے لوگوں کو لے مرتے ہیں۔

شرمگاہ سے زنا وغیرہ جیسے قبیح افعال سرزد ہوتے ہیں۔ [illegible] وہ باتیں ہیں جن سے اللہ تعالےٰ نے منع فرمایا ہے۔ [illegible] فرض ہے کہ تم قرآن و حدیث سے اچھی اور بری باتوں کا علم حاصل کرو۔ اور خود نہیں سمجھ سکتے تو سمجھنے والوں سے پوچھ لو۔ اچھی باتوں میں لگ جاؤ، بری باتوں سے دور رہو ورنہ پھر مرنے کے بعد بُری گت بنے گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہفت روزہ

خدام الدین

لاہور

جلد  — شمارہ 

جاری کردہ

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی قدس سرہٗ

مدیر مسئول

جانشین شیخ التفسیر

مولانا عبید اللہ انور

رئیس التحریر

مدیر

محمد سعید الرحمن علوی

ادارہ تحریر

بدل اشتراک

سالانہ	۴۰
ششماہی	۲۰
سہ ماہی	۱۰

ایک روپیہ

سُنّتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے "حضرتِ انسان" کے جد امجد سیدنا آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کو "خلیفۃ اللہ" کی حیثیت میں دنیا میں بھیجا تو ان کی خداداد عزت و عظمت کو جس نے سب سے پہلے چیلنج کیا وہ "ابلیس اعظم" اور "شیطان" تھا۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں بار بار موجود ہے۔ اس وقت سے لے کر آج تک دنیا میں حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔

قرآن کریم نے جن معدودے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے ان میں حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والتسلیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ان ذواتِ مقدسہ نے جس طرح حق و صداقت کی ترجمانی کی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کو نبھایا وہ ان کی معصوم فطرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس حق گوئی و بے باکی اور فرائض عبودیت کی بجا آوری کی انہیں جو قیمت ادا کرنا پڑی وہ ایک مستقل داستان ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ذواتِ قدسیہ استقامت کا پہاڑ ثابت ہوئیں۔ انہیں پتھروں سے مار دینے کی دھمکی دی گئی۔ [illegible] کا تمسخر اڑایا گیا، آگ میں جلانے کی کوشش کی گئی۔ ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ قتل و صلیب کے فیصلے ہوئے لیکن وہ اپنے مقام سے بال برابر نہ ہٹے انہوں نے اپنے پیدا کرنے والے خدائے عزیز و برتر کی بات پہلے سے زیادہ جوش و ہمت کے ساتھ دنیا کو سنائی اور بالآخر "طاقت" جو اس "اندھی طاقت" کے بل بوتے پر ان کی راہ میں کانٹے بچھانے والے ذلیل و خوار ہوگئے اور یہ حضرات سرخرو! حتیٰ کہ اس ذات قدسی کا دور آیا جو کائنات کی دولہا تھی۔ جس کی خاطر خالق کائنات نے

اس جہانِ رنگ و بو کو پیدا کیا تھا جس کی مثال پیش کرنے سے زمانہ قاصر تھا۔

مَضَتِ الدُّهُورُ وَمَا أَتَيْنَ بِمِثْلِهِ
وَلَقَدْ أَتَى فَعَجَزْنَ عَنْ نُظَرَائِهِ

جو رشد و ہدایت کا نیرِ تاباں تھا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس عظیم و معصوم انسان کو ایسے ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ الامان۔

اس نے اپنی زبانِ صداقت ترجمان سے حالات کی سنگینی کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:۔

"کہ مجھے راہ حق میں اتنا ستایا گیا کہ اس کی مثال نہیں ملتی"۔

بیگانے تو بیگانے تھے وہاں تو "اپنے" بھی قساوتِ قلبی، درندگی اور بربریت میں سب کچھ کر رہے تھے۔ لیکن صداقت کے اس آخری ترجمان و داعی نے کمال صبر و استقامت سے حالات کا جو مقابلہ کیا تو بالآخر "طاقت" گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی اور وہ اسی شہر میں جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کے نعرے لگاتا نظر آیا۔ جہاں سے چند سال پہلے اسے رات کی تاریکی میں نکلنا پڑا تھا۔ اس کے خدا نے يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا کا مژدہ سنایا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ مشرق و مغرب کے قافلے اس کے حضور آکر تلافی مافات کی کوشش کر رہے تھے اور وہ تھا کہ خندہ پیشانی سے سب کو حقائق و معارف الہیہ کی تعلیم دے رہا تھا۔

اس نبی امی اور رسولِ رحمت نے کارگاہِ حیات میں جینے کا جو ڈھنگ سکھایا۔ اس کے سچے اور حقیقی نام لیوا اس کے مطابق زندگی گزارتے رہے اور آج صدیاں بیت جانے کے بعد ایسے ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کشتگانِ عشقِ نبوی کو ہر زمانہ میں اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا جس قسم کے حالات سے ماضی میں مقربین بارگہ الست دوچار ہوتے رہے ہیں۔ تاہم تاریخ کا ایک ایک ورق اس زندہ حقیقت کی گواہی دے رہا ہے کہ اگر وقتی طور پر "اہل حق" پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا لیکن بالآخر کامیابی نے ان کے قدم چومے اور وہ اس کائنات میں اپنی قوتِ ایمانی کی بنا پر چھا گئے اور ان کی راہ میں کانٹے بچھانے والے "عبرت" کا نشان بن گئے۔

دراصل یہ سنتِ الٰہی ہے کہ طاقت و صداقت کی معرکہ آرائی میں وقتی طور پر طاقت کا پلڑا بھاری نظر آتا ہے اور بسا اوقات اتنا کہ طاقت اندھے پن کا مظاہرہ کرکے حالات و واقعات اور تاریخی صداقتوں سے منہ موڑ لیتی ہے اور خرمستی میں وہ کچھ کر گزرتی ہے کہ توبہ بھلی! لیکن صداقت کا ایک ہی ریلا اسے خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے۔

"طاقت" آپ کو پابجولاں کر سکتی ہے، آپ کو زنجیریں پہنا سکتی ہے۔ آپ کی زبان و قلم پر پہرے بٹھا سکتی ہے۔ اجتماعی طور پر آپ کو اپنے جذبات کے اظہار سے روک سکتی ہے لیکن آپ کے دل پر کوئی پہرہ نہیں بٹھا سکتی! اگر آپ کا دل زندہ ہے اور اپنے پیدا کرنے والے کی یاد سے معمور ہے تو دل سے اٹھنے والی صدا بغیر کسی رکاوٹ کے عرشِ الٰہی تک پہنچ کر طاقت کو بھسم کر سکتی ہے، یہی سنتِ الٰہی ہے، یہی قانونِ قدرت ہے اور قانونِ قدرت میں تبدیلی ناممکن!

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا

اے کاش! کہ "طاقت" کا مظاہرہ کرنے والے بھی اس قانونِ قدرت سے واقف ہوتے اور چند روزہ دنیا کے لیے نہ ختم ہونے والی زندگی تباہ نہ کرتے؟ لیکن جب مقدر ہی بگڑ جائیں تو اس کا کیا علاج؟

اللَّهُمَّ ارْحَمْ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ تَعَالَىٰ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔

علم
۵ جمادی الاولیٰ ۸۶ھ

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

خطبۂ جمعہ

ضبط و ترتیب : علوی

سلسلہ عالیہ قادریہ راشدیہ کے گل سرسبد، حضرت الامام لاہوری قدس سرہٗ کے نورِ نظر حضرت امام مدنی و سندھی رحمہما اللہ تعالیٰ کے تربیت یافتہ اور شاگرد رشید اور جمعیۃ علماء اسلام پنجاب کے امیر مولانا **انور** مدظلہم نے اسلامی نظام حیات کے لیے موجودہ تحریک کے دوران **مسلم مسجد لاہور** سے ۱۶ مارچ ۷۷ء کو گرفتاری پیش کی ۱۳ اپریل کو عدالت نے آپ کو رہا کر دیا اور اس طرح آپ کی "بے گناہی" پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس عرصہ میں آپ نے جیل میں جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا وہ اس خانوادہ کی دیرینہ روایت ہے۔ اور اس کے چرچے جیل کے اندر و باہر ہر اس شخص کی زبان پر ہیں جس نے یہ حالات دیکھے اور سنے۔ رہائی کے بعد ۱۵ اپریل کے جمعہ آپ نے اپنے "عظیم ابا" کی عظیم مسجد میں جو ولولہ انگیز خطاب فرمایا اس کی رپورٹ پیش خدمت ہے۔

(ادارہ)

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے!

بعد از خطبہ مسنونہ:۔

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ صدق اللہ العظیم

سورۂ حج کی آخری آیت کا ایک ٹکڑا تلاوت کیا گیا۔ جس کا حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے ترجمہ فرمایا: "اور محنت کرو اللہ کے واسطے جیسی کہ چاہیئے اس کے واسطے محنت!"

ماقبل و مابعد

اس ٹکڑے سے قبل کی آیات میں پروردگار عالم کی عظمت و تقدیس اور وحدانیت کا بڑے مؤثر پیرایہ میں ذکر ہے اور اس کے متصل اہل ایمان کو رکوع و سجود اور عبادت و بندگی نیز اعمال خیر بجا لانے کا حکم ہے اور اسی میں انسانیت کی فلاح کا راز مضمر بتلایا گیا ہے۔ پھر یہ ٹکڑا ہے جو تلاوت کیا اور آگے کچھ انعامات ذکر ہیں۔ مثلاً یہ کہ پروردگار عالم نے تمہیں پسند فرمایا۔ تمہارے لیے دین میں مشکل نہیں رکھی۔ وہی دین جو تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ اسی نے تمہارے لیے امتیازی نام "مسلم" پسند فرمایا۔ اور اس نام سے جہاں قرآن میں تمہارا تعارف کرایا گیا وہاں سابقہ آسمانی کتب میں بھی اسی نام سے تمہیں متعارف کرایا گیا ہے۔ اور یہ اعزاز اس لیے کہ رسول مدنی تم پر اور تم مخلوق خداوندی پر گواہی و شہادت کا فریضہ سرانجام دو۔ اقامت صلاۃ و ایتاء زکوٰۃ اور اللہ کو مضبوط پکڑنے کو اپنا وطیرہ بنا لو کہ وہی تمہارا مالک حقیقی ہے جو مالک بھی خوب ہے اور مددگار بھی خوب!

مولانا عثمانیؒ اور آیت زیر بحث!

اس ٹکڑے کے متعلق فاضل عثمانی قدس سرہٗ نے لکھا:۔ "اپنے نفس کو درست رکھنے اور دنیا کو درستی پر لانے کے لیے پوری محنت کرو جو اتنے بڑے اہم مقصد کے شایان شان ہو، آخر دنیوی مقاصد میں کامیابی کے لیے کتنی محنتیں اٹھاتے ہو۔ یہ تو دین کا اور آخرت کی دائمی [illegible]

ہے۔ جس میں جس قدر محنت برداشت کی جائے
اتنا ہی ثواب زیادہ ہوتا ہے۔" (حواشی مولانا عثمانیؒ ص۲۴۲)

جہاد

اس سے متصل ہی مولانا عثمانیؒ "جہاد و مجاہدہ" پر مختصراً اظہار خیال فرمایا لیکن ایسا کہ دریا بکوزہ کی مثال صادق آتی ہے :-

"لفظ مجاہدہ میں ہر قسم کی زبانی، قلمی، مالی، بدنی کوشش شامل ہے اور جہاد کی تمام قسمیں (جہاد مع النفس، جہاد مع الشیطان، جہاد مع الکفار، جہاد مع البغاۃ، جہاد مع المبطلین) اس کے نیچے مندرج ہیں۔"

مختصراً

یوں سمجھیں کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس راہ میں جو چھوٹی بڑی رکاوٹ ہے اسے دور کرنے کے لیے سعی و کوشش کا مقدس نام جہاد ہے اور یہ ایک ایسا فرض ہے جو ہر طریق سے پورا ہو سکتا ہے۔ جس انسان کو اللہ نے جس قسم کی صلاحیتوں سے نوازا ہے اسے اللہ کے لیے داؤ پر لگانا جہاد ہے اور اس میں افضل ترین درجہ راہ حق میں مردانہ وار کود کر دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غازی و شہید کا مرتبہ حاصل کرنا ہے۔

مزید یہ کہ تمام طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہونا بھی ضروری ہے اور جہاد کے لئے محض کفار کا مقابلہ ضروری نہیں بلکہ بقول مولانا عثمانیؒ اس میں نفس بھی شامل ہے اور ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے جہاد مع النفس کو "جہاد اکبر" سے تعبیر فرمایا۔ اس میں شیطان کا مقابلہ بھی شامل ہے، کفار تو واضح ہیں۔ بغاۃ (باغی) کا مقابلہ بھی ہے اور خدا اور رسول کے باغی سب سے زیادہ مقدم ہیں۔ اہل زیغ و ضلالت اور مبطلین و منافقین بھی شامل ہیں۔ قرآن عزیز نے نبی اُمّیؐ علیہ السلام کو کفار و منافقین سے جہاد کا حکم دیا (دیکھیں سورۂ توبہ اور سورۂ تحریم)

حالات کے تقاضے

ان ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ حالات کے تحت "جہاد" کے انداز تبدیل ہو جاتے ہیں۔ سیف و سنان کا مقابلہ ہو تو سیف و سنان سے جہاد ہوگا۔ اسلام و اسلامیت پر زبانی حملے ہوں تو زبان حرکت میں لانا ہوگی۔ قلم و لٹریچر کا فساد ہو تو اس انداز سے مقابلہ کرنا ہوگا الغرض جیسا منہ ویسا تھپڑ!

سامان جہاد

قرآن نے سورۂ توبہ میں اہل ایمان کو "سامان جہاد" کی طیاری کا جو حکم دیا وہ اپنی معنویت و وسعت کے کے اعتبار سے بالکل واضح ہے۔ اس اعتبار سے "انتخابی مقابلے" بھی جہاد ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ جب الحاد و دہریت کے پروردہ اور اسلام و اسلامیت کے باغی اس راہ سے قوم و ملّت پر مسلط ہونے کی فکر کرتے ہیں تو اہل ایمان کا بھی فرض ہے کہ وہ اسی راہ سے انہیں منہ توڑ جواب دے اور عوامی تائید سے ان کی مکاری و فریب کاری کا پردہ چاک کریں۔ مقام تاسف ہے کہ بعض لوگ اس "محاذ" کو دنیا و سیاست کا محاذ کہہ کر جی چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے خانقاہ و مدارس اور مساجد کا تحفظ بھی جبھی ہوگا جب اہل عدل و انصاف اور اہل صدق و صفا کے ہاتھ میں زمام حکومت ہوگی۔ بصورت دیگر انہیں حکومت کے کھونٹے پر ناچنا ہوگا۔ جیسا کہ سیاہ باطن اور سیاہ رو علماء سوء کو کرنا پڑتا ہے۔

موجودہ حالات

آپ جانتے ہیں کہ شرم و حیا اور انسانی اقدار و اخلاق سے عاری ایک شرزمہ قلیلہ نے عوام کی منفعۃ خواہش کے علی الرغم کس [illegible] دھونس، دھاندلی اور فریبکاری و مکاری سے حالات کو اپنے حق میں موڑنا چاہا لیکن جب عوام کا ہر طبقہ ان کی سازش کے مدمقابل سد سکندری بن گیا تو نمارده و فراعنہ اور ہٹلر و مسولینی کے ان

جانشینوں نے سرحد پار دشمنانِ خدا و رسول پر استعمال ہونے والا اسلحہ کلمہ گو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنی مذموم خواہش کے لیے پوری قوم اور ملت کو داؤ پر لگا دیا۔

الیکشن سے قبل

الیکشن سے پہلے جو دھاندلیاں کیں اور ایک بڑی تعداد کو جس طرح "بلامقابلہ" کامیاب کرایا گیا وہ تو ایک شرمناک داستان ہے ہی اس کے بعد جب الیکشن کے دن ہر طرح کی بدتمیزی کا مظاہرہ کرنے کے باوجود بھی کامیابی نہ ہوئی تو "جعلی نتائج" کا اعلان کر کے شرفِ انسانی کی توہین کی۔ اور جب یہ فراڈ تسلیم نہ کیا گیا تو ملک کے قاتل مسلح ہو کر سامنے آ گئے اور نالائق و بدنہاد انتظامیہ کو اس رُخ پہ ڈال دیا۔ خوفِ خدا اور جواب آخرت سے عاری و محروم انتظامیہ نے کراچی سے پشاور تک جس بدبختی کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔

مختلف شہروں اور قصبات میں سینکڑوں افراد شہید ہو گئے، لاتعداد لوگ زخمی ہوئے، ہسپتال بھرے پڑے ہیں، زخمی کراہ رہے ہیں اور یہ سب کچھ ایک فرد کی "کرسی" کے تحفظ کے لیے ہو رہا ہے۔ وہی کرسی جو بے ثبات ہے، وہی کرسی جس نے آج تک کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ اور پھر یہ کہ ملک ان کی جاگیر نہیں۔ لیکن آگ و خون کا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور شرم و حیا اور ندامت محسوس نہیں ہوتی۔

ہمہ گیر احتجاج

آج صورت یہ ہے کہ قوم کا ہر طبقہ سڑکوں پر ہے قابلِ احترام خواتین تک مصروفِ احتجاج ہیں۔ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ بعض بندگانِ شکم ان کے احتجاج و اضطراب کو ناجائز و غلط بتلاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے، کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا نے ایک نازک مرحلہ پر "ملت" کے لیے میدان میں آنے کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ یہ جانتے ہیں کہ عزت مآب خواتین اسلام کے صدرِ اوّل ہی میں میدانِ جہاد میں مصروفِ عمل رہی ہیں لیکن آج چونکہ عورتوں کا احتجاج ان کے جھوٹے خداؤں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو رہا ہے اس لیے یہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔

سلام عقیدت

مَیں جہاں اس یقین کا اظہار و اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تحریک میں جو جس انداز سے شریک ہے وہ اس کا مقدس عمل ہے وہاں ان شہیدانِ اسلام کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ جنہوں نے اپنے گرم گرم لہو سے ملت کے وقار کو چار چاند لگائے ہیں اور شجرِ اسلام کی آبیاری کی ہے۔ ان شہداء حریت نے درحقیقت قوم کے لیے ایثار و قربانی کی ایک درخشندہ مثال قائم کی ہے اللہ کی بے پایاں رحمتیں ہوں ان پہ اور خدا ان کے لواحقین و متعلقین کو صبر و استقامت سے نوازے۔

اسی طرح مستحق تبریک ہیں وہ لوگ جنہوں نے جیل کو آباد کیا اور عزم و ثبات کا ایک نیا باب سپردِ قلم کیا۔ جو لوگ زخمی ہو گئے۔ وہ جرأتوں کا زندہ نشان ہیں اور ہمارا رواں رواں ان کے لیے دعاگو ہے۔

وہ وقت دور نہیں جب اسلام کا نیّرِ تاباں طلوع ہو کر اس دھرتی کو منور کرے گا اور الحاد و دہریت کے رسیا خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین !

تارک نماز

بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلٰوةِ

(مسلم)

بندے کو کفر سے ملا دینے والی چیز ترکِ نماز ہے۔

سو کفر کے نزدیک ہے ترکِ نماز
اس سے ہوتا ہے ہمارا امتیاز

جذباتِ مُسلم

اگر دنیا میں زندہ ہیں تو دنیا کو دکھا دیں گے
کہ یا خود مر مٹیں گے، یا حریفوں کو مٹا دیں گے

رگ جاں مدتوں سے تشنۂ ذوقِ شہادت ہے
ہم ان کی پیاس آبِ تیغ عریاں سے بجھا دیں گے

زمانہ سے ہمیں خواہش نہیں ہے شورِ تحسین کی
ہماری دادِ جانبازی شہیدِ کربلا دیں گے

رہے گی تابکے پژمردگی گلزارِ ملت پر
ہمارے خون کے چھینٹے اسے نشو و نما دیں گے

بلا سے خشک لب جائیں گے اس دنیائے فانی سے
ہماری تشنگی کا ساقئ کوثر صلا دیں گے

کفن سادہ پہننا ننگ ہے رنگیں مزاجوں کو
ہم اپنے داغہائے خوں سے گل بوٹے بنا دیں گے

جہاں میں دینِ بیضا شمع ہے نورِ الٰہی کی
یہ جھونکے بادِ مغرب کے اسے کیونکر بجھا دیں گے

رہیگا سایہ زن فیضِ نبوّت فرقِ غازی پر
جنابِ مصطفٰیؐ دادِ کمالِ مصطفٰیؐ دیں گے

اُلٹ دیں گے مرقع پھر بساطِ کفر و باطل کا
فروغِ ملتِ بیضا سے محفل جگمگا دیں گے

تقاضا ہے یہی بینائیٔ دستِ شجاعت کا
عروسِ فتح کے چہرہ سے اب پردہ اٹھا دیں گے

— جناب حکیم عبدالمجید سیفی مرحوم کی ڈائری سے شکریہ کے ساتھ —

مجلسِ ذکر

ضبط و ترتیب : علوی

اخلاص اور اتباعِ سنّت

حضرت مولانا جمیل احمد میواتی مدظلہم

مرشد الانور مدظلہم گزشتہ جمعرات سے ایک دن قبل (۱۳ اپریل ۷۷ء) جیل سے تشریف لائے۔ مجلس ذکر ہوئی اور تقریر حضرت مولانا جمیل احمد صاحب میواتی نے فرمائی۔ جو ہدیۂ قارئین ہے۔　　　　(ادارہ)

بعد الحمد والصلوٰۃ :-

اس دنیا میں کروڑوں انسان کلمہ سے محروم ہیں اور جن کو نصیب ہوا صرف اللہ کی توفیق اور اس کے فضل سے ہوا۔ اس میں ہمارا کمال نہیں۔ پھر کلمہ کے بعد جو اعمالِ صالحہ کرتے ہیں وہ بھی اللہ کے کرم سے !

ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز تو بہت بڑی بات ہے ایک مرتبہ اللہ کہہ کر دوسری مرتبہ اللہ کہنا بھی اس کی توفیق کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اگر اللہ کو منظور نہ ہو تو پہلی مرتبہ بھی اللہ نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ مسلسل ذکر و فکر اللہ تعالےٰ ہی کا کرم ہے ایسا جس کا شکر ادا کرنا بھی ہمارے بس میں نہیں۔ اللہ تعالےٰ سب کو اپنا شکر ادا کرنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالےٰ جس بندے سے خوش ہوتے ہیں اس کو ایمان کی دولت سے نوازتے ہیں۔ اس کو اعمال صالحہ کی توفیق نصیب فرماتے ہیں پھر اس کو اپنا خیال اور یاد نصیب فرماتے ہیں۔

اور ترتیب اس طرح سے ہے کہ عقائد صحیح ہوں تو اللہ تعالیٰ عبادات کی توفیق نصیب فرماتے ہیں اور جب عبادات کا مسئلہ حل ہوتا ہے تو اس کے بعد اخلاق کی درستگی نصیب فرماتے ہیں اور اخلاق بھی اخلاص سے متعلق ہیں۔

سب سے زیادہ اہم چیز عبادات کی قبولیت کے بارے میں اخلاص ہے۔ بخاری شریف کی سب سے پہلی حدیث اخلاص ہی کے بارے میں ہے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ نیک کام کرنے سے پہلے انسان اپنے دل کو ٹٹول لے کہ میں یہ کس ارادہ سے کر رہا ہوں۔ کس جذبہ سے کر رہا ہوں؟ جس جذبہ سے کرے گا وہ اس کی نیت کہلائے گی۔ اگر اللہ پاک کو راضی کرنے کے لیے کر رہا ہے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق کر رہا ہے تو پھر یہ نیک عمل صورتاً بھی نیک ہے سیرتاً بھی نیک ہے اور اگر اللہ کو راضی کرنے کا جذبہ نہیں ہے دنیا کے دکھانے کا جذبہ ہے یا شہرت کا جذبہ ہے یا واہ واہ کا جذبہ ہے کہ میرا نام آ جائے، میری شہرت ہو جائے تو اللہ اس کا اجر دنیا میں دے دیں گے لیکن خدا کی رضا نصیب نہ ہوگی تو سب سے بڑی چیز اخلاص ہے اور اخلاص کا معنی ہے کہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت ہو اور کوئی نیت نہ ہو، اب ہر شخص اپنے دل کو ٹٹولے کہ میں جو نیک کام کر رہا ہوں ذکر کے لیے آ رہا ہوں، نماز کے لیے آ رہا ہوں، خیرات کر رہا ہوں، حج کے لیے جا رہا ہوں تو یہ کس نیت سے ؟

حدیث میں ہے کہ بعض اعمال پہاڑ کے برابر ہوں گے۔ اور اجر ان کا رائی کے برابر بھی نہیں ہوگا اور بعض اعمال رائی کے برابر ہوں گے اور اجر ان کا پہاڑ کے برابر ہوگا۔ تو یہ اخلاص کی بات ہے۔

تو کوئی کام ہو چھوٹا یا بڑا، اللہ کی رضا کے لیے کرو۔ چاہے وہ خون بہانا ہو چاہے وہ گولیاں کھانا ہو، خواہ مسجد بنانا ہو، خواہ درود شریف پڑھنا ہو، خواہ ذکر کرنا ہو، خواہ خیرات کرنی ہو۔ اللہ کے لیے کریں۔

دوسرے یہ کہ کس طریق سے کریں؟ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد صحابہ کرامؓ نے کر کے دکھایا۔ اس طرح کریں۔ اس کو کہتے ہیں اتباعِ سنت!

اگر نیت میں فتور آ گیا تو پھر معاملہ بگڑ جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین شخص اللہ کے حضور آئیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، میرے لیے کیا لے کر آئے تو عالم علم کے متعلق کہے گا کہ پڑھا اور پڑھایا۔ اللہ فرمائیں گے تو نے عالم کہلانے کے لیے پڑھا تو نوالوں کے لیے پڑھا، تیری نیت تو دنیا میں پوری ہو گئی۔ اس کے بعد شہید آئے گا۔ اس سے بھی سوال ہو گا۔ وہ جان کی قربانی کا ذکر کرے گا۔ اللہ فرمائیں گے کہ تو نے واہ واہ کے لیے کیا میں نے تجھے اجر دے دیا۔ اب کوئی حصہ نہیں۔ اسی طرح سخی جواب دے گا کہ میں نے خرچ کیا۔ لیکن علام الغیوب فرمائیں گے دنیا کی واہ واہ مقصود تھی وہ مل گئی اب کیا؟

بہرحال جو کرو خلوصِ نیت سے اور اسوۂ نبوی کے مطابق کرو۔ اس کے بعد بھی خدا سے دعا کرو کہ اے اللہ! جو کچھ چاہیے تھا وہ تو نہ ہو سکا اور جتنا ہوا اس میں بھی بہت نقص ہیں۔ تو اپنے کرم سے قبول فرما۔

حضرت شیخ الہندؒ جب جیل گئے تو آپ پر ایک گونہ وحشت و دہشت طاری تھی۔ ساتھیوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ معلوم نہیں کہ اللہ کے یہاں قربانی قبول ہو گی یا نہیں؟ جب حضرت شیخ الہندؒ جیسے بزرگ کا یہ حال ہے تو پھر ہمیں تو بہت ڈرنا چاہیے۔

علماء کا ساتھ دینا، دین کے لیے قربانیاں دینا، گولی کھانا، جیل جانا بڑی سعادت کی بات ہے لیکن بات وہی ہے کہ رضاءِ الٰہی اور خلوص سامنے ہو ورنہ نقصان ہو گا۔ لوگوں کی واہ واہ کا شوق رکھنا بڑی گھاٹے کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس سرزمین پر اور آسمان کے نیچے صحابہؓ سے بڑھ کر کوئی محبوب و مطلوب نہیں وہ معیارِ حق و صداقت ہیں۔ دنیا بھر کے علماء، اولیاء، اقطاب، غوث، ابدال سب مل کر ایک ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے برابر نہیں ہو سکتے۔

بقول حضرت الامام ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ صحابہ کرامؓ بہترین امتی ہیں اور ان کو بُرا بھلا کہنے والا بدترین ہے۔ سب سے بہتر صحابہؓ اور ان کو برا کہنے والا سب سے بُرا۔ ایسا نہ ہو کہ ساری عمر کی کمائی جاتی رہے۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ لوگ جو آج علماء کا ساتھ دے رہے ہیں، اسلام کا ساتھ دے رہے ہیں بڑے خوش نصیب ہیں وہ اگرچہ کیسے ہی ٹوٹے پھوٹے ہیں اور بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اسلام کے خلاف منصوبے بنا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام جاوے ہی جاوے۔

بدنصیبو! اسلام تو تمہارے ہی لیے ہے۔ اسلام تو کہیں نہیں جاتا یہ تو قیامت تک رہے گا۔ تم نے یہ کفر کا کلمہ کہا۔ کفر کا سینگ تو نہیں ہوتا۔ بدلوں کا نام اسلام ہے اور دولوں کا نام ہی کفر ہے۔ اللہ ایک ہے اسلام ہے۔ اللہ دو ہیں کفر ہیں۔

بہرحال اللہ تعالیٰ ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔ میں تمہارے لیے دعا گو ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

کچھ دن پہلے ایک ریٹائرنگ آفیسر نے نوائے وقت میں ایک مضمون کے ذریعہ اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ چونکہ موجودہ آئین میں ہماری ملازمتوں کو تحفظ حاصل نہیں اس لیے دھاندلی پر مجبور تھے۔

ہم خود اس عنوان پر کچھ لکھنا چاہتے تھے لیکن ایک "پولیس افسر" نے اس سلسلہ میں ۲۰ اپریل کے نوائے وقت میں جواب لکھا ہے جو ہم ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ یہ جواب ہمارے دل کی آواز ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کر سکیں۔ (ادارہ)



"نوائے وقت" میں ایک ریٹائرنگ آفیسر صاحب کے خیالات نظر سے گزرے انہوں نے فرمایا ہے کہ مجسٹریٹ ہوں یا کوئی اور افسر چونکہ ۱۹۶۲ء کے آئین میں ملازمت کو تحفظ حاصل نہیں لہٰذا افسر اپنے ضمیر اور ایمان کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ایمان اگر ایمان ہے تو وہ کسی شرط کا طالب نہیں۔ کون کہے گا کہ یہ اور یہ شرطیں پوری کی جائیں تو پھر ایمانداری ممکن ہے ورنہ نہیں۔

میں اُن ریٹائرنگ آفیسر صاحب کی خدمت میں التماس کروں گا۔ کہ ان کی وضاحت عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مترادف ہے جنہیں ضمیر کا تحفظ منظور نہیں وہ ملازمت محفوظ ہونے کے باوصف راہ عدل سے عدول اختیار کئے رکھتے ہیں اور جو کو خود اعتمادی اور عزتِ نفس کی دولت میسر ہے وہ بدترین خدشات کے باوصف وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کے نزدیک از روئے آئین و انصاف بجا ہو۔ کیپٹن شفیق احمد صاحب نے پتے کی بات کہی ہے کہ ہم اگر رازق خدا ہی کو مانیں اور ہر حال میں بھروسا خدا ہی پر رکھیں تو دل میں کوئی خوف جاگزیں نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنے ضمیر کے اندر جھانکیں تو صاف نظر آئے گا کہ ہم نے انصاف اور دیانت کی راہ خوف کے باعث چھوڑی ہے یا لالچ سے مغلوب ہو کر۔ بعض اوقات دونوں صورتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ حق یہ ہے کہ خوف شرک ہے اور ہوس بُت پرستی۔ اور یہ نتیجہ ہے ایمان کے فقدان کا۔

وہ چیز اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے!
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

میرا تعلق پولیس کے شعبے سے ہے سینئر درجے میں ہوں۔ نوجوانی بھی اسی محکمے کی نذر ہوئی اور جوانی بھی۔ اب بڑھاپے کے قریب ہوں لہٰذا پولیس اور عدالت دونوں کے تماشا ہائے عجب دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جو شخص بھی مخلص یا دیانت دار اور فرض شناس ہو وہ دوسروں کے مقابل خسارے میں نہیں رہتا۔ لوگوں کے دل میں جو عزت ہوتی ہے وہ الگ اور خود اطمینانِ قلب وہ شے ہے جسے دولت کے میزان میں تولا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ انمول موتی ہے۔ اس کے باب میں خدا کا فقط شکر ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔

میں نے اپنے رفقاء اور ماتحتوں سے بالعموم کہا ہے

اور برملا کہا ہے کہ پاکستان کی پولیس فرنگی حکومت کی ضروریات اور تھیں۔ وہ دھونس اور رعب قائم رکھنا چاہتے تھے لہٰذا پولیس تندمزاج اور بے درد رویّہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ برِعظیم کے باشندے پولیس سے دور دور اور خائف اور ششدر رہتے تھے۔ حالانکہ خود انگلستان میں انگریز اپنی پولیس کو جو سبق دیتا تھا وہ یہ تھا کہ پولیس دھونس جمانے کے بجائے خیرخواہی کا مظاہرہ کرے۔ تہلکہ مچانے کے بجائے ہمدردی دے، آفت نظر آنے کے بجائے محبوب و مقبول ہو۔

انگلستان میں پولیس عوام کی خادم تھی مگر برِعظیم میں عوام کی حاکم اور انگریز حاکم کی خادم تھی۔ انگریز نے ہندو اور مسلمان پولیس آفیسر کو اس کے عقیدے سے مٹا کے ایک ہاتھ میں لال کتاب پکڑا دی اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا۔ گویا انگریز بڑا صاحب تھا اور پولیس کا ملازم چھوٹا صاحب تھا۔ ایک گورا حاکم ایک کالا حاکم، مگر کالا حاکم گورے حاکم کا غلام اور چاکر۔

پاکستان بن جانے کے بعد یہ رویہ بدلنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا خود وہ جو ہمیں میں سے ہمارے حاکم بنے وہ بھائی اور عزیز بن کر رہنے پر تیار نہ ہوئے سارے نہیں لیکن اکثر کا مزاج یہی رہا۔ ہمارے عزیزوں اور بھائیوں نے مسندِ حکومت پر متمکن ہو کر خدمت کو شعار کم بنایا، اور مسند کے گرد قوت کا حصار زیادہ تعمیر کیا۔ چنانچہ پولیس سے بھی اس ضمن میں خدمت لی۔ انگریز تو فقط برطانوی اقتدار کا تحفظ اور رعب چاہتا تھا۔ مگر اپنوں نے سیاسی دھڑے بندیوں کی تعمیر و تخریب میں بھی پولیس سے کام لیا۔ نتیجہ یہ کہ پولیس عوام کے قریب نہ آسکی۔ وہ حاکموں ہی کا کھلونا رہی۔

ہمیں یاد ہے کہ مرحوم قربان علی خان کو اس سیاسی دھڑے بندی سے فائدہ اٹھانے کے ذوقِ فراواں نے اتنا بے باک کر دیا کہ وہ بڑے بڑے جغادری سیاست دانوں کے چچا جان بن بیٹھے۔ جس سے بنی اسے بنا دیا۔ جس سے بگڑی اسے برباد کر دیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک بادشاہ گر قوت کا جلوہ دیکھتے تھے۔

نتیجہ یہ کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا حکومت پولیس کو ان کے اصل فرض ... اپنے گروہی اور سیاسی مقاصد کے حصول و تحفظ کی خاطر استعمال کرتی چلی گئی۔ اور پولیس بھی خوشی سے اس صورت حال سے عملاً اتفاق کرتی چلی گئی۔ ظاہر ہے کہ جب حکومت اپنے محدود مفادات کے لئے پولیس کو غلط طور پر استعمال کرے تو پولیس اس تعاون سے ذاتی مفادات کے حصول کی نت نئی راہیں نکال لیتی ہے۔ خواہ وہ مفادات کتنے ہی بھیانک ظالمانہ اور احمقانہ ہوں۔ مطلب یہ کہ حکومت اور اس کے دھڑے کو خوش رکھو اور پھر دھڑلّے سے ہر ظلم اور ہر زیادتی روا رکھو۔ کون پوچھنے والا ہے لیکن ایک عدالت ضمیر کی بھی ہے ایک عدالت احکم الحاکمین کی بھی ہے۔ یہاں ضمیر کے حضور میں جوابدہی جاری رہتی ہے اور آگے چل کر جو عقوبت حاصل ہوگی وہ جدا ہے ——

سیدھی سی بات ہے پولیس مجرموں کی راہ روک سکتی ہے پولیس خود سزا دینے کی مجاز نہیں "پولیس مقابلے" قسم کی کوئی شے اسے کسی آئین نے نہیں بخشی۔ آئین کے مطابق سزا دینا یا نہ دینا عدالت پر منحصر ہے۔ اسی طرح اگر ملک کی سیاسی جماعتیں اپنے اپنے حقوق کی خاطر باہم ایک دوسرے کے مقابل آئیں تو پولیس نہ کسی پارٹی کی معاون ہے اور نہ دشمن، اسے تو فقط سلامتی و امن کا تحفظ کرنا ہے۔

میں اپنے عزیز و محترم رفقاء سے پوچھتا ہوں کیا وہ واقعی یہ فریضہ امانت و دیانت سے انجام دیتے ہیں یا ایک سیاسی پارٹی یا پارٹیوں کے مدِّمقابل بن جاتے ہیں؟ جو بھی دوست اپنے ضمیر سے فیصلہ کرے گا اور غرض و حرص سے بالا ہو کر سوچے گا۔ وہ یقیناً محسوس کرے گا کہ وہ اکثر اوقات زیادتی کرتا ہے۔ اور اپنے فرائض کی حدود سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے۔

میں بعض رفقاء سے تبادلۂ خیال بھی کرتا ہوں۔ جواب ملتا ہے کیا کریں، سروس ہے بچے ہیں۔ مگر یہ بہانے ضعفِ ایمان کے شاخسانے ہیں۔ نوکری کو اگر جانا ہی ہے تو ہزار خدمت اور چاکری کیجئے کسی وقت بھی اچانک جا سکتی ہے۔ بلکہ اسی جرم کی پاداش میں خدا نوکری سے محروم کر دے گا۔ کہ یہ بے انصاف افسر یا ملازم خدا کے بجائے بندوں پر بھروسہ کر کے راہ عدل سے عدول کرتا تھا۔ پھر

یہ بھی نہ کوئی سوچے کہ جب وہ کہتا ہے نوکری ہے بچے ہیں۔کیا عین اسی وقت موت کا فرشتہ نازل نہیں ہو سکتا؟ پھر نوکری کو کیوں جرم کی ڈھال بنایا جائے۔اسی طرح جن بچوں کی خاطر ہر بے ایمانی اور ستم کو روا رکھا جا رہا ہے کیا وہ کسی حادثہ ارضی وسماوی کا شکار نہیں ہو سکتے؟ کیا یہ رویّہ بتانِ وہم وگمان کی پرستش نہیں؟ کیا خدا پر ایمان رکھنے والے فرد کا طور وطریق یہی ہوتا ہے؟ ع

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

میرے ساتھ ایک سے زیادہ بار ایسا ہوا ہے کہ کسی نہایت غلط کام کی فرمائش ہوئی۔میں نے معذرت کر لی حکم ہوا بستر باندھ لیجئے۔میں نے بستر باندھ لیا اور تبادلے یا سبکدوشی کا انتظار کرنے لگا۔مگر تبادلہ ہی ہوا۔میں نئی جگہ پہنچ گیا۔اللہ کا ہزار ہزار کرم ہے ضمیر پر کوئی غلاظت کا بوجھ نہیں اور پھر اللہ کے فضل وکرم سے آج تک بگڑا بھی کچھ نہیں۔اگر کچھ بگڑتا تو میں بالکل خندہ پیشانی سے سہہ جاتا۔

میں کہتا ہوں بھائیو! غلط حکم کی تعمیل سے اگر ایک افسر معذوری کا اظہار کرے تو دوسرا سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔اگر فرض کیا کہ دوسرا بھی معذوری کا اظہار کرے۔تیسرا بھی، چوتھا بھی تو کیا وہ غلط فرمائشیں خودبخود واپس نہیں لے لی جائیں گی؟ ہم لوگ غلط اور ظالمانہ فرمائشوں کی بلا چون وچرا تعمیل کر کے انصاف دشمنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں مظلوموں کی حوصلہ شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔قتلِ انصاف کے عمل میں ظالموں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

کیا یہ امر ہماری شرائط ملازمت میں شامل ہے؟ کیا ہمارا حلف از روئے آئین امن وانصاف کی راہ اختیار کرنا اور بے لوث وبے خوف دیانتداری کے ساتھ فرض ادا کرنا نہیں؟ باوقار لوگ تو قول کا بھی پاس کرتے ہیں حلف کے احترام کا تو قصہ ہی دوسرا ہے، حلف کا احترام حدود حرم کی پاسبانی کا سا مقدس فریضہ ہے۔

میں اپنے رفقاء کو ایک اور بات سے بھی آگاہ کر دوں کہ جو لوگ غلط حکم چلا کے اور ڈرا یا لالچ دے کر غلط کام لیتے ہیں وہ بھی غلط کام کرنے والوں کے قدردان از رہِ دل نہیں ہوتے۔وہ انہیں ایک ہتھیار اور بے وقار وسیلۂ غرض اندوزی جانتے ہیں۔وہ بھی دل سے عزت اسی کی کرتے ہیں جو با اصول ہو۔یہ الگ بات ہے کہ وقتی مصلحت اور نخوت کے باعث اپنے اقتدار واختیار کی نمائش اور بقا کی خاطر با اصول لوگوں کو اپنی غرض کی راہ سے اِدھر اُدھر ہٹا دیں یعنی کھڈے لائن لگا دیں۔مگر میں تو اس سے بھی تعرض نہیں کرتا۔میں تو فقط اتنا جانتا ہوں کہ عزت اور ذلت خدا کے ہاتھ میں ہے۔کوئی بے ایمانی کا کمایا ہوا تاج سر پر رکھ کر لعنت کا مستحق بن جائے یا ایمان داری کے کلاہِ فقر میں عزت کی بارگاہ بن جائے۔فیصلہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے ـــــ پھر یہ باطل پروری اور حق کشی کیوں؟

وفیات

حلقہ خدام الدین کے متعلقین کو اس خبر سے دکھ ہوگا کہ جناب منشی سلطان احمد صاحب جمعہ (۲۲/۴/۷۷) پونے دو بجے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

منشی صاحب مرحوم ربع صدی سے زائد عرصہ انجمن خدام الدین سے متعلق رہے۔دفتری امور کے تمام تر نگران وہ تھے۔حضرت لاہوری قدس سرہٗ اور آپ کے بعد آپ کے خلف الرشید حضرت مولانا انور سے بہت تعلق خاطر تھا۔صوم وصلوٰۃ کے سختی سے پابند تھے۔مسجد وانجمن کی فلاح کا بہت زیادہ خیال فرماتے۔ان کے بعد ان کے لڑکے گلزار صاحب ادارہ سے متعلق رہے۔

نماز عصر کے بعد نابیناؤں کے سکول کی گراؤنڈ میں حضرت مولانا انور نے نماز جنازہ پڑھائی۔کرفیو کی پابندیوں کے باوجود کثیر تعداد میں عوام نے شرکت کی۔ہر آدمی ان کی خوبیوں کا ذکر کر رہا تھا۔حضرت مولانا انور نے جمعہ کے خطبہ میں بھی ان کی خدمات کو سراہا اور دعاء مغفرت کی۔جنازہ کے بعد ان کی میت کھاریاں (ان کا آبائی علاقہ) لے جائی گئی۔جہاں دوبارہ جنازہ کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ادارہ خدام الدین مرحوم کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ع: خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

● گذشتہ ہفتہ آسٹریلیا مسجد لاہور کے خطیب مولانا عبدالرؤف کی والدہ انتقال کر گئیں۔مرحومہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں۔اللہ تعالیٰ

اسلامی ملک کے سربراہ کا مقام

تحریر: میاں محمد ذوالفقار علی رکن جمعیۃ علماء اسلام بھاٹی گیٹ، لاہور

ایک اسلامی ملک کا سربراہ ایک شرعی منصب ہے ملت کی امیری دین کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ امیر ملت اصولِ دین کے مطابق ہر قسم کی اصلاح و فلاح اور ملت کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ دین کی حفاظت کرتا ہے، وہ علم کا جامع ہوتا ہے اور اپنے تمام اقوال و افعال میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ شریعت اس کی قائد ہوتی ہے۔ وہ دینی علم کی نشر و اشاعت کرتا ہے۔ دین کی عملی بنیادوں (نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) کو قائم رکھتا ہے اور معاشرے میں ان کی طرف سے غفلت پیدا نہیں ہونے دیتا۔ وہ کتاب اور سنتِ رسول اللہ سے ہٹ کر نہ دائیں طرف جاتا ہے نہ بائیں طرف۔ عصرِ اول میں ائمہ مسلمین کا جس بات پر اجماع ہو چکا ہو اس سے بھی نہیں ہٹتا۔ وہ دین کو قائم کرنے کا نصب العین لے کر اٹھتا ہے اور سب سے پہلے اپنی ذات پر دین کو قائم کرتا ہے۔ وہ بھلائیوں کو خدا کے حکم سے نافذ کرتا ہے، اور برائیوں کا سدِ باب کرتا ہے۔ سیرت اور کردار کے ہر گوشے میں اسلام کا سچا نمونہ بن کر رہتا ہے۔ اس میں مسلم قوم کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت و اہلیت ہوتی ہے۔ وہ جماعت کا مشورہ لینے کا پابند رہتا ہے۔ وہ ایوانِ حکومت میں سیاست ملی اور خارجی کے فیصلے کرتا ہے۔ میدانِ جہاد میں سالارِ لشکر کی حیثیت سے نماز پڑھاتا ہے اور کتاب اور سنت کی روشنی میں معاملات و مسائل کے فیصلے کرتا ہے، وہ ایک حکمران بھی ہے، سالار فوج بھی اور امام مسجد بھی۔ وہ ایوانِ حکومت میں عبادت و ریاضت کرتا ہے۔ اس کی زندگی اور موت صرف خدا کے لیے ہوتی ہے۔ وہ دین کو سیاست سے اور سیاست کو دین سے جدا نہیں کر سکتا۔ امیر ملت کی اطاعت شریعت کی مقرر کردہ حدود کے اندر محدود ہے۔ جب امیر قواعدِ دین کے مطابق حکم دے جو قرآن اور حدیث کے خلاف نہ ہو اس کا حکم واجب الاطاعت ہے۔

اسی طرح جب اس نے اپنے اجتہاد سے کوئی ایسا حکم دیا ہو جس کا قرآن اور سنت سے سہارا لیا گیا ہو تب بھی اس کی اطاعت واجب ہے مگر جب وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے خلاف حکم دے تو مسلم جماعت کے لیے اس کی اطاعت واجب نہیں۔ اسلامی ملک کا سربراہ خلفائے راشدین جیسے حضرات کے نقشِ قدم پر چلتا ہے۔ اسلامی خزانہ پر نہ آپ بوجھ بنتا ہے اور نہ ہی قومی خزانے کی ناجائز تقسیم کی اجازت دیتا ہے۔ اسلامی ملک کے سربراہ کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق مملکت کا نظام چلانا، دین و ملت کا دشمنوں سے دفاع کرنا اور اس غرض کے لیے جنگ و جہاد کے جملہ فرائض انجام دیتا ہے، لوگوں میں عدل قائم کرنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنا، مجرموں پر سزاؤں کا نفاذ کرتا ہے۔ قوم کے مال اور عزت کی حفاظت کرنا اور امن و امان قائم کرتا ہے، وہ اس منشا کو پورا کرتا ہے جس کے لیے اللہ تعالےٰ نے اسلام کو نازل کیا۔ چیزوں کے بھاؤ کو اس قدر بڑھنے کی اجازت نہیں دیتا جو عوام کی طاقت خرید سے باہر ہوں۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہوتا وہ مسلمانوں کے خادم اور چوکیدار کی حیثیت سے ملتا ہے وہ کمزوروں اور حاجت مندوں کی خبر گیری کرتا ہے۔ مسلمان اس کو قومی روپے سے عیش پرستی و تن پروری کا موقع بھی نہیں دیتے اور اس کو یہ بھی حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کے مشترکہ مال سے اپنی اور اپنے مشیروں کی ضروریات پوری کرے۔

احیاء ملت تجدید علم اور استقلالِ وطن

بانیٔ دارالعلوم کا تاسیسی فکر

از:- مولانا محمد سالم صاحب قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس حجۃ اللہ فی الارض، شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ قدس اللہ سرہٗ العزیز نے مسلک اہل السنت والجماعت کی محققانہ تقلید پر فرمائی اور وقت وبخت کے لحاظ سے یہ ایک عظیم تر ملی ضرورت کی تکمیل تھی گذشتہ صدی کے لمحے لمحے نے اس پر ناقابل تردید شہادتیں فراہم کی ہیں۔ کہ اگر تاریخ کے اس انقلابی موڑ پر بروقت یہ دستگیری نہ کی جاتی تو سرزمین ہند پر ملتِ اسلامیہ تاریخ اسپین کے نئے ہولناک تجربے سے دوچار ہو جاتی۔

اس پس منظر کے ساتھ دارالعلوم کے مسلک و مشرب کو سمجھنے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک مصنوع اپنی خوبی یا خرابی نقص یا کمال اور افادیت کی محدودیت یا وسعت میں اپنے صانع کے فکر کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ دیکھنے والا بیک نظر اس کی خصوصیات و امتیازات کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کے کمال فن یا اس کے نقائص و عیوب سے صانع کے ماہر فن نہ ہونے کے بارے میں بلا تامل ایک نتیجے تک پہنچ جاتا ہے اسی طرح علم و تعلیم کے حصول کے لیے وقت و زمانہ اور مرز و بوم کی نبض شناسی کے ساتھ اجتماعی راہیں بنانے کو بھی ایک عظیم تر صنعت پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں خوبی و خرابی، نقص و کمال، محدودیت و وسعت اور جامعیت و ناتمامیت، جاذبیت اور عدم جاذبیت کے تمام پہلوؤں کو ملحوظ رکھنا اسی طرح ضروری ہوتا ہے جس طرح ایک صنعت کار اپنی صنعت میں تمام پہلوؤں کی رعایت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا، پھر جس طرح کسی صنعت سے یکسر ناواقف سے اس کے بنانے کی امید خلاف عقل و مشاہدہ ہے۔ اسی طرح ملی مزاج شناسی کے ساتھ تعلیم کی اجتماعی راہ سازی کی صنعت کے معرض وجود میں آنے کی توقع بھی کی جا سکتی ہے جو بذات خود علم و آگہی کے بحر نا پیدا کنار کا شناور ہو اور اس کا عمل اس کے علم پر شاہد ہو۔ اور علم و عمل کی اسی انسانی امانت سے وہ دیانتدارانہ طور پر عہدہ برآ ہونے کے فکر کا حامل ہو اور وقت کے ارباب علم و نظر اور اصحاب زہد و تقویٰ کی توجہات ظاہر و باطن کے لیے اس کا اخلاص کمال جاذبیت رکھتا ہو۔

بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ اللہ فی الارض شیخ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ العزیز کی ذات گرامی کو ان تمام علمی اور عملی خصوصیات کے ساتھ حق تعالیٰ نے ملت اسلامیہ کے لیے اس وقت ذریعہ بقا بنا کر پیدا فرمایا جب کہ وہ محرومیٔ اقتدار کی کربناکیوں میں مبتلا تھی۔

متاعِ علم وفکر کے لٹ جانے کی ناکامیوں سے دوچار تھی اور فرنگی استعمار کے بے تحاشا مظالم کی دہشت ناکیوں میں گھری ہوئی تھی۔

ان حالات کے نیم تر ان مراحل کے بعد خداداد فراستِ باطن سے ملتِ اسلامیہ کو سنبھالنے کے لیے حضرت مؤسس علیہ الرحمۃ نے ایک مدرسۂ فکر کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند کے بارے میں اپنے تاسیسی فکر کا محور تین امور قرار دیئے۔

(۱) مسلمانوں کو محرومیٔ اقتدار کے الم سے ہٹا کر عمل کی طرف لانا۔

(۲) متاعِ علم وفکر کے امین مکاتیبِ فکر کے مٹ جانے پر سوگواری کے بجائے عزمِ تجدید کو دلوں میں زندہ کرنا۔

(۳) محکومیت ومقہوریت کے اس عہدِ ابتلاء میں ملت کے قلب ودماغ میں دینی حمیت اور روحِ حریت کو برقرار رکھنا۔

حضرت مؤسس نے اپنے مذکورہ نقاط فکر کی عملی تکمیل کو "تعلیم دین" میں دائر فرما کر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور گذشتہ صدی کا ایک ایک شب و روز اس فکر اور صاحبِ فکر کی اصابت وصداقت پر گواہ بنا اور آج تک بن رہا ہے کیونکہ یہ دلیل کسی حقیقت کی محتاج نہیں ہے کہ علمی بصیرت وبصیرت ہی ناکامیوں کے اسباب کی نشان دہی کر کے راہ کامیابی کی جانب گامزنی کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔

یہی علم کی روشنی ہے کہ زندہ قومیں "تلك الایام نداولھا بین الناس" کے ضابطۂ فطرت کے تحت اسی سے اپنے عہد مغلوبیت میں اپنے ملی وجود کی برقراری اور پھر غلبہ و استیلاء کی راہیں تلاش کرتی ہیں اور اسی نورِ علم سے قوموں کو اپنے نظریۂ حیات پر زندہ رہنے کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔

اس لیے حضرتِ بانیٔ دارالعلوم علیہ الرحمۃ کے ملی زندگی کے لیے تعلیمی راہ منتخب فرمانے کو جہاں اربابِ معرفت نے الہامِ ربانی قرار دیا وہیں تاراج شدہ دہلی کے تفسیر کے، ولی اللّٰہی لکھنؤ کے فقہی اور خیرآباد کے معقولی مکاتبِ فکر کو دیوبند کے حدیثی مکتبِ فکر میں سمو کر زندہ کرنا حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ صاحب کا وہ بے مثال کارنامہ ہے کہ جس نے جریدۂ عالم پر اس مکتب فکر اور بانیٔ مکتب فکر کے نام کو اربابِ دانش وبینش کے اعتراف کے مطابق اس طرح سدا ثبت کر دیا ہے کہ وقت کے مؤرخ کا قلم ان دونوں کے ذکر کے بغیر تاریخِ ہند کو یکسانہ منصف قرار نہیں دیا جا سکے گا۔

دارالعلوم کی یہ علمی بنیادیں اور مؤسس دارالعلوم کے اس مقبول عنداللہ مخلصانہ علمی فکر کے ثمرات ونتائج وہ گراں مرتبت اور سرآمد روزگار شخصیتیں بنیں جن کو ہر دور کے اہلِ علم وبصیرت نے "لا تزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق" کے مصداق قرار دیا ہے جنہوں نے حقائق کتاب وسنت کی ترجمانی، ذوق ومسلکِ اہل السنت والجماعت کے مطابق اس طرح فرمائی کہ اصحاب تدبر کے لیے وہ حکمت وحجت کا گنج گرانمایہ بن کر عامۃ المسلمین کے لیے موعظۂ حسنہ ثابت ہو کر اور معاندین اسلام کو مبہوت کرنے کے لیے مجادلۂ حسنہ قرار پا کر "ادع الی سبیل ربك بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن" کی بے مثال عملی تفسیر بنی اور ہمیشہ بنی رہے گی۔

" دارالعلوم دیوبند نے بحیثیت مکتبِ فکر تصوف کو اپنی دوسری بنیاد قرار دے کر اطاعت و عبادت کے اسی مقصدِ زندگی کی روح کو قت میں زندگی بخشی اور اس کے پاکیزہ نفوس اکابر نے زہد واتقا اور اخلاص وللہیت تواضع وخاکساری کا پیکر جذاب بن کر عامۃ المسلمین کا دین و اہلِ دین سے نیازمندانہ ومعتقدانہ ربط قوی قائم فرمایا۔ جس نے ایک ایسے معاشرہ اسلامی کو برپا کیا کہ عامۃ المسلمین نے اپنے اجتماعی اور انفرادی، بیرونی اور خانگی تقاریب مسرت اور حادثاتِ غم میں علماء کرام سے زیادہ اپنا رفیق ومخلص کسی کو نہ پایا اور ادھر حضرات علماء کرام نے اپنے فضل وکمال کے ساتھ تواضع ومساوات کی عملی تفسیر بن کر اپنے آپ کو عامۃ المسلمین کا خادم بنایا اور ان کی زندگیوں کے ہر موڑ پر ان سے قریب اور ان کے شریک بن کر بعد خلوص دینی رہبری سے ان کے دلوں میں گھر بنایا۔

یہ اسلامی اسوۂ عمل گو جدید نہیں تھا لیکن محدود وسائل کے دور

میں اس ربط و ارتباط کا پیمانہ بھی محدود ہی تھا۔ حضرت مؤسس دارالعلوم نے دوق وسعت ایمانی فراست اور نئے دور کی مزاج شناسی کے ساتھ جہاں عوامی چندوں کے ذریعہ مفت اجتماعی تعلیم کو جاری فرمایا وہیں دینی بنیادوں پر عامۃ المسلمین سے علماء کرام کے قریبی رابطے کو بھی دارالعلوم دیوبند کے مسلکی ذوق کا اہم ترین جزو قرار دیا اور وقت نے مؤسس دارالعلوم دیوبند کی اس فکری رفعت پر مہر تصدیق ثبت کی اور دین اور دینی قدروں کو اقتدار چھن جانے سے جو خطرۂ عظیم پیش آچکا تھا۔ اس کی بڑی حد تک تاریخی تلافی عوام اور علماء کے اسی قوی ترین رابطے کے ذریعہ ہوئی اور برصغیر کے مسلم معاشرے کو اس کے ذریعہ ایک ایسا امتیاز میسر آیا کہ جس کی نہ صرف اسلامی ممالک میں بھی آج کوئی مثال ہی نہیں ملتی بلکہ وہاں کے ارباب بصیرت علماء برصغیر میں عوام و علماء کے اس تعلق کو دیکھ کر حیرت و مسرت کے ساتھ اس پر خراج تحسین پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مؤسس دارالعلوم دیوبند کے مذکورہ تین الہامی فکری نقاط اس کی تین عظمتوں کو اپنے دامن اجمال میں لپیٹے ہوئے تھے وہ جب تاریخی تفصیل بن کر عالم وجود میں آئے تو حضرت قاسم العلوم کا فکری نقطۂ اول ملت کی عملی ترقی کے لیے مہمیز بنا اور اس کے بنیادی مقصد کی عملی تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند کے اکابر اولین نے ملت کے سامنے دینی نظام حیات کو از سر نو مرتب کر کے نہ صرف پیش ہی کیا بلکہ اپنی زندگیوں کو پیہم سعی و عمل کی تصویر بنا کر ملت میں اس عزم اور ہمت عمل کو ابھارا کہ جس نے ظالمانہ فرنگی تسلط کے بعد دس سال کے مختصر ترین وقفے میں ملت اسلامیہ کو ہزیمت و مایوسی کے شرمناک احساس سے نکال کر ظالم و قوی فرنگی استعمار و اقتدار کے بالمقابل دفاعی موقف سنبھال لینے کا حوصلہ عطا کیا۔ اور اس کی بے یقینی سے نجات پاکر یہ ملت عمل کی انقلاب انگیز تاثیر سے آشنا ہوئی اور نہ صرف اس کے رُکے ہوئے قدم ہی منزل کی جانب تیز گامی کے ساتھ رواں دواں ہو گئے بلکہ اس کے نقوش قدم برصغیر میں بسنے والی دیگر مذہبی اکائیوں کے لیے بھی سنگ میل ثابت ہوئے۔

ملت ہمہ اسلامیہ کی فکر کا احیاء و تجدید مؤسس دارالعلوم دیوبند کا دوسرا الہامی فکری نقطہ تھا۔ جس کی عملی جلوہ گری نے قلیل ترین وقفے میں دہلی، لکھنؤ، رام پور، اور خیرآباد کر دیوبند کی سرزمین پر یکجائی صورت میں زندہ کر دیا۔ اور حدیث رسول ﷺ کے قرآنی جلوہ میں فقہ معین کی بصیرت مندانہ فعلیہ کے ساتھ معقول و منقول کے کاروانِ علوم کو لے کر دیوبند نے جب میر کارواں کی حیثیت سے تجدید دین کا کامیاب کردار ادا کیا تو ۱۸۵۷ء کی تمام ترہولناکیوں کے بارے میں مشیت کے رمز شناس مارمیں کو اعتراف کرنا پڑا کہ :۔

ع خدا شرّے برانگیزد کہ خیر مادراں باشد

اور حضرت مؤسس علیہ الرحمۃ کا تیسرا فکری نقطہ صالح اجتماعیت کی اساس پر ملت کی سیاسی تربیت کا وسیع عنوان بنا جس کے تحت اس درسگاہ کے نبض شناسان وقت اکابر نے اپنے علم و اخلاص سے ملت میں روح حریت کو جلا بخشی اور اپنے فاضل فرزندِ دارالعلوم دیوبند کے پیدا کردہ اسی صالح اجتماعی شعور کی قیادت میں استقلال و آزادی کے حصول کی پُرآشوب راہیں کامیابی کے ساتھ طے کر کے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برصغیر اپنی منزل مراد تک پہنچ گیا تھا۔

ان بے غبار حقائق و نقاط کی روشنی میں یہ ایک حقیقت کا اعتراف ہے کہ برصغیر میں ملت کی ہمہ جہت علمی بود و نمود، تحریر و تقریر کی مشکور مساعی کے ذریعہ فکر سازی کی اجتماعی حدود اور سیاسی دستوں میں دین اور حریت فکر کے ساتھ ملی وجود کی برقرار کا عزم و حوصلہ ملت اسلامیہ کو عطا کرنے میں دارالعلوم دیوبند کے قیام نے جو جداآفریں کردار ادا کیا ہے وہ حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند اور ان کے مخلص رفقائے کرام کا ایک ایسا ملت نواز احسان ہے جس سے ملت اسلامیہ ہندیہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گی کہ گذشتہ سو سال کی طویل تاریخ میں ارباب بصیرت علماء بالغ النظر زعماء اور منصف مؤرخین نے دارالعلوم بانی دارالعلوم اور جامعیت دارالعلوم

ہندوستان میں علمِ حدیث

دسویں صدی ہجری سے پہلے

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا شیخ عبدالحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۲ھ) کی ذات گرامی سے ہوا اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی ذات گرامی سے ہندوستان میں علم حدیث کے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ورنہ اس عہد سے پہلے ہندوستان علم حدیث سے بالکل بے گانہ نہیں تھا۔ لیکن آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ دسویں صدی تک ہندوستان میں معقولات اور فقہ و تصوف کے سوا علمِ حدیث بالکل عنقا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے مؤرخین نے دو واقعات ایسے تحریر کئے ہیں جن سے اس غلط فہمی کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ اس لیے سب سے پہلے ان دو واقعات کا تجزیہ اور ان سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔

علم حدیث سے بے اعتنائی کے سلسلے میں ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لیے علماء کرام کی ایک مجلس منعقد ہوئی۔ مناظرہ کے ایک فریق حضرت نظام الدین اولیاء ۷۲۵ھ تھے اور دوسری طرف تریپن بڑے بڑے علماء تھے۔ گفتگو کا آغاز ہوا۔ مورخ فرشتہ لکھتا ہے:

"اس مجلس مناظرہ میں حضرت شیخ نے اپنے مدعا کے اثبات کے لیے حدیث نبوی السماع مُباحٌ لِاَھلِہٖ کو پیش کیا۔ قاضی رکن الدین جو شیخ کے فریق تھے انہوں نے کہا کہ حدیث پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تو مقلد ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کی کوئی روایت پیش کیجیے تاکہ قبول کی جائے۔ حضرت شیخ نے فرمایا۔ میں حدیث صحیح مصطفوی پیش کر رہا ہوں اور تم امام ابو حنیفہؒ کی روایت چاہتے ہو۔ شاید حکومت و اقتدار کا نشہ رکھتے ہو، تو بہت جلد تم اپنے عہدہ سے معزول ہو جاؤ گے۔ بادشاہ (جو مجلس میں موجود تھا مظاہری) حدیث پیغمبر کو سن کر متفکر ہوا اور کچھ نہ کہا۔

"السماع مباحٌ لاھلہٖ"۔ یہ جملہ امام غزالیؒ نے احیا علوم الدین میں بطور فتوی کے نقل کیا ہے۔ اس کو حدیث نبویؐ قرار دینا مورخ فرشتہ کا تسامح ہے۔ بہر حال بعض لوگوں نے اسی لطیفہ کو حضرت شیخ کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے کہ امام غزالیؒ کے قول اور حدیث رسولؐ میں حضرت امتیاز نہ کر سکے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس دور میں ہندوستان علم حدیث سے نا آشنا تھا۔

مؤرخ فرشتہ ہی کی بات دیکھی جاتے تو اس نے سلطان الاولیاء کے حالات میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حضرت فقہ و تفسیر و حدیث اور علم کلام کا پوری طرح استحضار رکھتے تھے۔ "در فقہ ابو حنیفہ و تفسیر و حدیث و اصول کلام استحضار تمام داشت"۔

اور حضرت شیخ کے حالات میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں مقامات حریری کے چالیس مقالے زبانی یاد کئے تھے۔ اس کے کفارے کے طور پر دہلی آکر مولانا کمال الدین دہلوی سے مشارق الانوار کا درس حاصل کیا اور اس کو بھی حفظ کر ڈالا۔

سیرالاولیاء حضرت کے حالات میں ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کے مصنف میر خورد دہلوی ہیں۔ انہوں نے بھی

اس مناظرہ کی پوری تفصیل لکھی ہے مگر انہوں نے کہیں اس فقرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے جس کو مؤرخ فرشتہ نے حضرت کی زبان مبارک سے حدیث کہہ کر بیان کیا ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ صغانیؒ کی مشارق الانوار جو صحیحین کی دو ہزار چھ سو بائیس حدیثوں پر مشتمل ہے۔ حضرت کو زبانی یاد تھی۔ آج کے موجودہ دور میں شاید ہی کوئی ایسا محدث مل سکے جس کو اتنی بڑی تعداد میں حدیثیں زبانی یاد ہوں۔ یہی نہیں بلکہ میر خورد نے حضرت کی سند بھی نقل کی ہے کہ ان کے استاد مولانا کمال الدین سند میں یہ الفاظ لکھنے کے بعد، کہ

"بان قرأ هذا الاصل المستخرج من الصحيحين على ساطر هذہ السطور"

صحیحین سے حدیثوں کا یہ مجموعہ جو منتخب کیا گیا ہے اس کو ان سطروں کے لکھنے والے سے پڑھا ہے۔

یہ الفاظ لکھتے ہیں:۔

قراۃ بحث واتقان وتنقیح معانیہ وتنقیر مبانیہ۔

یہ پڑھائی کامل بحث و اتقان اور معانی کی تحقیق اور اس کی بنیادوں کی کھوج کرید کے ساتھ ہوئی۔

یہ ساری تفصیلات شہادت دیتی ہیں کہ مؤرخ فرشتہ نے حضرت کی طرف منسوب کر کے جو روایت بیان کی ہے وہ ان کا تسامح ہے۔ اس کو کسی طرح صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مغالطہ کی وجہ شاید حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ بھی ہو جو فوائد الفواد کے نام سے مشہور ہے۔ ان ملفوظات میں بکثرت حدیثیں آپ کی زبان مبارک سے مذکور ہیں اور ان کے رموز و اسرار بھی بیان فرمائے گئے ہیں۔ حضرت کے ان ملفوظات کو پڑھنے کے ساتھ ضروری ہے کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ باقاعدہ تصنیف و تالیف کے لیے حضرت نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ علاوہ ازیں فضائل اعمال میں ضعیف روایتوں کا بھی اعتبار کیا جاتا ہے اس لیے اس طرح کی روایتوں کا ان میں آ جانا ناگزیر تھا۔ تاہم ان ملفوظات کو بیان فرماتے ہوئے کبھی آپ تنبیہ فرما دیتے تھے کہ "ایں قول مشائخ است" یہ مشائخ کا قول ہے، حدیث نہیں ہے۔ ان ملفوظات میں متعدد جگہ اس قسم کے الفاظ موجود ہیں کہ کسی کے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا۔ "ایں حدیث در کتب احادیث کہ مشہور است و معتبر نیامدہ"۔ اگر کبھی روایات میں اختلاف ہوتا تو آپ فرماتے۔ "آنچہ در صحیحین است آں صحیح باشد"۔ کبھی فرماتے کہ یہ حدیث میں نے از خود کسی کتاب میں نہیں دیکھی ہے۔ بلکہ اپنے استاد مولانا علاء الدین اصولی سے سنی ہے۔

بہر حال حضرت کے یہ حالات شہادت دیتے ہیں کہ آپ کا علم حدیث میں کیا مقام تھا۔ اس لیے مؤرخ فرشتہ کی ایک غلط عبارت سے اس کے خلاف استدلال کسی طرح درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علم حدیث سے بے اعتنائی کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ علاء الدین خلجی (۶۹۵ — ۷۱۶ھ) کے دور میں مصر کے ایک محدث "شمس الدین ترک" حدیث کی ترویج و اشاعت کی دھن میں ہندوستان تشریف لائے کہا جاتا ہے کہ وہ اسی غرض سے حدیث و متعلقات حدیث کی کوئی چار سو کتابیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ ایک جامع شرح لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں، پر ابھی وہ ملتان ہی تک پہنچے تھے کہ انہیں معلوم ہوا کہ بادشاہ نماز پنجگانہ کا پابند نہیں اور نہ جمعہ و جماعت کا اسے خیال ہے، رنجیدہ ہوتے اور الٹے پاؤں واپس چلے گئے۔

اس واقعہ کو نہایت آب و تاب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان محدث کی واپسی کی وجہ سے عرصہ تک ہندوستان علم حدیث سے محروم رہا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ محدث کہاں واپس گئے اور کس حکومت میں پہنچے کہ جس کا بادشاہ قطب دوراں تھا؟ یہ زمانہ تو عالم اسلام پر تاتاریوں کی یلغار کا تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں تو تاتاری فتنہ وسط ایشیا، خراسان، ایران وغیرہ سب کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

کیا بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں متعدد خلفاء ایسے نہیں گزرے ہیں جن کی زندگیاں دینی معیار پر نہیں تھیں؟

تو کیا ان خلفاء کے زمانے میں محدثین کرام دمشق و بغداد وغیرہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ ممکن ہے کہ کسی خاص شخص کا یہ حال رہا ہو مگر عام طور پر محدثین و علماء انہیں نامساعد حالات میں اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ علاء الدین خلجی نہیں بلکہ محمد شاہ تغلق (۷۲۵-۷۵۲) جس کے مقابلہ میں علاء الدین خلجی کو فرشتہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے، اسی تغلق کے عہد میں شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال عالم نہیں بلکہ علامہ جمال الدین ذہبی اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے شاگرد مولانا عبدالعزیز اردبیلی دلی تشریف لائے ہیں اور محمد تغلق کے دربار میں باریاب ہوئے ہیں۔ صاحب نزہۃ الخواطر ان کے حالات میں تحریر کرتے ہیں:

قرأ بدمشق على شيخ الاسلام تقي الدين بن تيمية الحراني وبرهان الدين برکج وجمال الدين المزي وشمس الدين الذهبي وعلى غيره من العلماء ثم قدم الهند وتقرب الى محمد شاه تغلق فاحسن اليه واكرمه۔

دمشق میں شیخ الاسلام تقی الدین ابن تیمیہ حرانی اور برہان الدین برکج و جمال الدین مزی و شمس الدین ذہبی وغیرہ علماء سے تعلیم پائی، پھر ہندوستان آئے اور محمد شاہ تغلق کے مقربین میں داخل ہوئے بادشاہ نے ان کے ساتھ حسن سلوک کیا اور بڑی عزت کی۔ (نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۶۶)

مشہور سیاح ابن بطوطہ کے حوالے سے مؤلف نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہ مولانا عبدالعزیز اردبیلی نے محمد تغلق کو ایک دن چند حدیثیں سنائیں جو بادشاہ کو بے حد پسند آئیں، بہت خوش ہوا۔

وقبل قدمي الفقيه وأمر ان يؤتى بصينية ذهب فيها الف تنكه فصبها عليه بيده وقال هي لك مع الصينيه۔ (نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۱۶۶ و سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۱۵۲ ج ۲)

"ان کے دونوں قدموں کو بادشاہ نے بوسہ دیا۔ اور حکم دیا کہ سونے کی سینی میں ہزار تنکہ (اس زمانہ کا سکہ تھا) لایا جائے۔ خود بادشاہ نے اٹھا کر ان تنکوں کو آپ پر نچھاور کیا اور کہا کہ یہ تنکے مع سینی آپ کے ہیں۔"

غور کرنے کی بات ہے کہ جب مولانا شمس الدین ترک جیسے مجہول الحال محدث کی واپسی سے ہندوستان میں علم حدیث کی بیگانگی پر استدلال کیا گیا ہے تو ابن بطوطہ کی عینی شہادت سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جس ملک میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ذہبی، علامہ مزی کا شاگرد آئے اور قیام کرے، اس کی ایسی زبردست پذیرائی اور قدردانی ہو، بھلا اس ملک میں علم حدیث کا چرچا نہ ہوا ہوگا؟

مجھے اس کا انکار نہیں کہ اس ملک میں درۂ خیبر سے آنے والے علماء نے عام طور پر معقولات اور فقہ و تصوف کو رواج دیا اور اس ملک کے نصابِ تعلیم میں یہ فنون حاوی رہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان علم حدیث اور اس کے خدام سے بالکل خالی تھا بلکہ تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے اس ملک میں حدیث کے خدام کی ایک جماعت نظر آتی ہے۔ بالخصوص گجرات و جنوبی ہند میں ان کی تعداد نمایاں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ سرزمینِ ہند پر اسلام کی کرنیں قرنِ اول ہی میں پہنچ چکی تھیں مگر ۶۰۲ھ کے بعد جو قطب الدین ایبک کا عہد ہے باقاعدہ اسلام نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ ایسی صورتِ حال میں کیا یہ ملک امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، اور امام مالکؒ جیسے محدثین کی طرح علم حدیث کی تدوین میں حصہ لیتا؟ اور فنِ اسماء الرجال و فنونِ حدیث کو مرتّب کرتا؟ یہ تو انہیں بزرگوں کا حصّہ تھا۔

خیال کرنے کی بات ہے کہ بجز ان ملکوں کے جہاں اسلام پہلی صدی ہجری میں پہنچا۔ دوسرے وہ ممالک جہاں اسلام صدیوں کے بعد پورے طور پر پہنچا۔ ان کو تدوینِ حدیث میں حصہ لینے کا کیا موقع تھا۔ یہ سعادت تو انہیں خوش نصیب ملکوں کے لیے مقدر تھی جہاں اسلام پہلی صدی میں پہنچ گیا۔

بقیہ: بانی دارالعلوم کا تاسیسی فکر

کے مذکورہ بالا تاریخی امتیازات کا بھرپور اعتراف کر کے ملّت اسلامیہ ہندیہ کی عظمت و شرافت کو غیر قانونی بنا دیا ہے۔

والحمد للہ اولاً و آخراً

مسئلہ تقلید اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ

از: مولوی ندیم احمد الواجدی فاضل دیوبند

(قرآن و سیرت سوسائٹی حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ ایک علمی اجتماع بتاریخ ۱۰ اگست ۱۹۷۹ء میں پڑھا گیا)

دینی تجدید کی تاریخ میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کی ذات گرامی ایک ممتاز مقام رکھتی ہے، ہندوستان میں جہاں کہیں بھی علم کا چرچا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سکول سے جا کر مل جاتا ہے۔ جو مال پہنچ کر حضرت شاہ ولی اللہ نے زانوے ادب طے کیا، اور ابعد میں جو سکول انھیں کے نام سے مشہور ہوا، ولی اللّٰہی سکول جو مدرسہ رحیمیہ کی ایک ارتقائی شکل ہے اپنا ایک مخصوص طرز فکر رکھتا ہے۔ یہ ایک انتہائی جامع ہمہ گیر اور وسیع سکول ہے اس اسکول میں عقل و نقل اور کشف و الہام کا بڑا خوبصورت اور حسین امتزاج ملتا ہے مگر اس سکول کی ہمہ گیری یا جامعیت کا جو مفہوم ہندوستان کے بعض مکاتب فکر نے سمجھا ہے وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار اور خیالات کی واقعی تعبیر ہرگز نہیں ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اس تعبیر کی روشنی میں ولی اللّٰہی فکر کی صحیح قدر و قیمت متعین نہیں ہو سکتی۔ ولی اللّٰہی اسکول کا فکر مبہم، ناقابل فہم اور غیر مانوس خیالات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک صاف ستھرا اور انتہائی واضح فکر ہے۔ پھر نہ جانے کیسے حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف ایسے خیالات کا انتساب کیا جاتا رہا ہے جن کی تردید خود ان کی کتابوں سے، اور بعد میں آنے والے ان کے شاگردوں کے طرز عمل سے ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ہندوستان کا ایک طبقہ غیر مقلد سمجھتا ہے تعجب یہ ہے کہ اس سلسلے میں ان کی تمام تحریریں تو نظر انداز کی جا چکی ہیں اس خاص ماحول سے بھی صرف نظر کیا گیا ہے جس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے آنکھیں کھولیں، پرورش پائی، اور جس کی اصلاح کے لیے آپ کو منصب تجدید سے سرفراز کیا گیا۔ آپ کی علمی تاریخ کو پس منظر و ماحول کا موقف بھی شاہ صاحبؒ کے مسلک کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، مگر اسے بھی نظر انداز کیا گیا۔

میرے لیے یہ انتہائی سعادت کی بات ہے کہ اہل علم کے اس اجتماع میں مجھے حضرت شاہ ولی اللہؒ پر مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس موقع پر بھی یہ چاہیے کہ شاہ صاحبؒ کے فقہی مسلک پر مختصر سی گفتگو کروں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ حیدرآباد میں جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے ایک حلقہ ایسا موجود ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مسلک صحیح طریقے پر پیش نہیں کرتا۔ ایسا کرنا کسی شخصیت کے ساتھ انصاف ہرگز نہیں ہے بلکہ سچ پوچھیے تو یہ ایک بڑا ظلم اور علمی تاریخ کی بڑی بد دیانتی ہے اور سب سے زیادہ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ ہندوستان کے اہل بدعت بھی اپنے اصل اور خلاف سنت کاموں کے لیے شاہ صاحبؒ کا نام استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔

شاہ صاحبؒ جنہوں نے سنت کے اندر نکھار پیدا کرنے کے لیے عمر بھر قلم سے جہاد کیا اور بدعت کے خلاف مسلسل جنگ کی اسی بدعت میں ملوث قرار دے دیے گئے ہیں اور بے اصل و لغو کاموں میں ان سے استدلال کیا جانے لگا ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے علمائے دیوبند کو جنہوں نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار کی صحیح ترجمانی کا بڑا اہتمام کیا، اور اس کی اشاعت میں زبردست حصہ لیا۔ حلقہ دیوبند سے اپنے انتساب کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی تعلی یا مبالغہ محسوس نہیں ہوتا کہ دیوبند نے ولی اللّٰہی فکر سے وابستگی کا جس قدر حق ادا کیا ہے اور اس فکر کی جس قدر اشاعت کی ہے شاید ہی کسی دوسرے مکتب فکر کو اس کی سعادت حاصل ہوئی ہو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کسی بھی دور میں تقلید کے مخالف نہیں رہے ہیں، وہ تقلید کے حامی تھے اور ان مذاہب کے پابند نہ تھے بلکہ وہی خیال فرماتے تھے جو ان کی صحیح بنیاد ہو

[illegible]

[illegible] احکام [illegible] ... اب [illegible]

[illegible] کا [illegible] اور [illegible]

[illegible] اور [illegible] کی اقسام و شرائط [illegible] اختلاف [illegible] کے

جاب [illegible] مطلق [illegible] مذہب کی تعریف ان دونوں کا فرق وغیرہ جیسے

اہم مباحث بھی آگئے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کا ایک اور رسالہ "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" بھی ہے۔ اس میں فقہ کے تمام ادوار کا احاطہ کیا گیا ہے، اور تقلید کی اہمیت وضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں بھی جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی گراں قدر اور معرکۃ الآرا تالیف ہے اس کے مباحث ملتے ہیں۔

حجۃ اللہ البالغہ کے ایک مستقل باب میں شاہ صاحبؒ نے مسئلہ تقلید کے موافق ومخالف پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔ ایک جگہ ابن حزم کے [illegible] خیال کی بڑے لطیف انداز میں تردید فرمائی ہے کہ

التقلید حرام و لا یحل	تقلید حرام ہے اور آں حضرت
لاحد ان یاخذ قول	صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ
احد غیر رسول اللہ	کسی دوسرے کے قول کو بغیر دلیل
صلی اللہ علیہ وسلم بلا برهان	کے اختیار کرنا جائز نہیں ہے

(ص۱۵۵ ج۱)

ان [illegible] اس [illegible] باتیں کی ہیں۔ حضرت [illegible]

[illegible] کی رائے صحیح

[illegible] حجۃ اللہ [illegible]

[illegible] اور لوگ [illegible] یہ جانتے ہیں کہ

[illegible] میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] اور یہ [illegible] وہ

حکم منسوخ بھی [illegible] کی تردید نہیں ہوتی۔

[illegible] کے باوجود وہ اس حکم کے مخالف [illegible] اس لیے اتباع کرتے [illegible] کسی امام سے منقول ہے۔ شیخ عزالدین کے حوالے سے حضرت شاہ صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ متعد فقہا [illegible] کے ماخذ کی کمزوری اور استدلال کے ضعف کے باوجود [illegible] کی تقلید کرتے [illegible]

(تفصیل حجۃ البالغہ ج ۱ ص۱۵۳ باب حکایت الناس قبل المائۃ [illegible] میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)

[illegible] یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاہ صاحبؒ مطلقاً تقلید کے مخالف نہیں تھے بلکہ اس سلسلہ میں شیخ عزالدین کے مؤید تھے اور ان کی رائے [illegible] فرماتے تھے۔

مناسب ہوگا اگر ہم تفصیل سے شاہ صاحبؒ کے خیالات

[illegible] اسی [illegible] شاہ صاحب [illegible]

[illegible] فرماتے ہیں

اعلم ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن الفقہ فی زمان الشریف مدونا ولم یکن البحث فی الاحکام یومئذ مثل البحث من ھؤلاء الفقہاء (ص۴)

اس زمانے میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ آپؐ سے مختلف واقعات کے سلسلے میں شریعت کا حکم دریافت کرتے تو آپ شرعی حکم بیان فرما دیتے۔ لوگوں کو اچھا کام کرتے ہوئے دیکھتے تو اس کی تحسین فرماتے یا خاموشی اختیار فرماتے۔ کوئی غلط فعل دیکھتے تو اس پر نکیر بھی ہوتی، اور یہ سب کچھ عام مجلسوں میں بھی ہوتا اور خصوصی مجلسوں میں بھی بعد میں جب فتوحات کا سلسلہ دراز ہوا اور صحابہ مدینہ سے منتشر ہو کر مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیلنا شروع ہوئے تو نئے نئے واقعات وحالات پیش آئے صحابہ نے اپنے اجتہاد اور قوتِ استنباط کے ذریعے فیصلے کیے، یہیں سے مسائل میں تنوع اور فتاوی میں اختلاف واقع ہوا۔ ہر جگہ کے لوگ اپنے متعلقہ صحابی کے فتاوی پر عمل کرتے۔ دورِ تابعین میں ان فتاوی کی اشاعت خوب کثرت سے ہوئی۔ ان حضرات نے احادیث کی روشنی میں ترجیح وتطبیق کا غیر منظم کام شروع کیا، بعض فتاوی راجح قرار دیے گئے بعض کو مرجوح اور ضعیف کہہ کر ترک کر دیا گیا (الانصاف میں ص۳ سے ص۱۶ تک اسی اجمال کی تفصیل ملتی ہے) عقد الجید میں شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا ہے:- ان الناس لم یزالوا من زمن الصحابۃ الی ان ظھرت المذاھب الاربعۃ یقلدون من اتفق من العلماء من غیر نکیر من احد یعتبر انکارہ، ولو کان ذالک باطلا لانکروہ (ص۶۳)

اس تفصیل سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ تقلید صحابہ میں بھی رہی ہے اور تابعین میں بھی، رہا کسی مسئلے میں غور وفکر کرنے اور غلط کو صحیح سے جدا کرنے کا سوال ہے طبقۂ عوام میں اس کی اہلیت پہلے بھی کبھی [illegible] اس لیے عوام [illegible] تقلید کا وہی مفہوم تھا جو آج بھی رائج ہے، البتہ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ پہلی دو صدیوں میں کسی ایک مذہب کی تقلید ضروری نہیں تھی بلکہ حالات ومواقع کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے فتاوی پر عمل کر لیا جاتا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ [illegible] اور عقد الجید میں بھی ابوطالب مکی کے حوالے سے یہ بات فرمائی ہے:- ان الناس کانوا فی المائۃ الاولی والثانیۃ غیر مجتمعین علی التقلید لمذھب واحد بعینہ، قال ابوطالب المکی فی قوت القلوب ان الکتب والمجموعات محدثۃ والقول

معالاحسانی والشیادہ ... سبب الاجد ... الناس و ... [illegible] ... حکایۃ
کل شی واستقر علی مذہبہم بکن الناس قدیما علی ذالک فی الوجہین الا ... [illegible]

(عقد الجید ص) البتہ حجۃ اللہ البالغہ میں فی المائۃ الاولی والثانیۃ کے بجائے المائۃ الرابعۃ کے الفاظ ہیں۔ یہ ناقل کا سہو معلوم ہوتا ہے ... سب ہیں کہ ائمہ مذاہب کی تقلید چوتھی صدی ہجری سے بہت پہلے شروع ہو چکی ہے۔ اس کی تائید "الانصاف" کی عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:۔ بعد المائتین ظہر فیہم التمذہب للمجتہدین باعیانہم وقل من کان لا یعتمد علی مذہب مجتہد بعینہ، وکان ہذا ہو الواجب فی ذلک الزمان (ص۵۲)

یہ بھی ممکن ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ میں ایسے ہی کچھ لوگوں کا ذکر ہو جو کسی ایک مذہب کی تقلید کے پابند نہیں ہوتے تھے مگر غیر مقلدین کی اتنی تعداد تو ہر دور میں ہر جگہ موجود رہی ہے۔

بعد میں جب فقہ کے چاروں مکاتب ظہور میں آ گئے تو ان کی تقلید شروع ہو گئی اور اس پر امت کا اتفاق ہو گیا کہ ان چار مذاہب کے علاوہ کسی مذہب کی تقلید جائز نہیں ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

ہذہ المذاہب الاربعۃ المدونۃ المحررۃ قد اجتمعت الامۃ او من یعتد بہا منہا علی جواز تقلیدہا الی یومنا ہذا (ص۱۵۴)

عقد الجید کے ... سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مذاہب کے علاوہ کچھ اور بھی مذاہب تھے جن کا بعد میں کوئی وجود باقی نہیں رہا۔

لما اندرست المذاہب الحقۃ الا ہذہ الاربعۃ کان اتباعہا اتباعا للسواد الاعظم والخروج عنہا خروجا عن السواد الاعظم (ص۳۸)

اس تقلید کی ابتداء کیسے ہوئی، کیا سبب قرار پایا؟ اس کا جواب بھی حجۃ اللہ البالغہ میں مذکور ہے:۔

انہم اطمأنوا بالتقلید ودب التقلید فی صدورہم دبیب النمل وہم لا یشعرون وکان سبب ذلک تزاحم الفقہاء وتجادلہم فیما بینہم (ص۱۵۳ ج۱)

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مجتہدین کے مذاہب کی تقلید، اور ان کا اتباع ایک ایسا راز ہے جس کا الہام اللہ نے اپنے اہل علم بندوں پر کیا ہے اور ان کے سواد اعظم کو اس پر متفق کر دیا کہ وہ لوگ ائمہ مذاہب کی تقلید کریں اور اس دائرے سے باہر نہ ہوں۔ فرماتے ہیں:

وبالجملۃ فالتمذہب للمجتہدین سر الہمہ اللہ تعالی العلماء وجمعہم حیث یشعرون او لا یشعرون (الانصاف ص۵۹)

شاہ صاحب کی رائے میں تقلید شخصی کی ضرورت اب پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے ... [illegible] ... بھی ... [illegible] ... اور ... [illegible] ... بتا رہے ہیں:

وفی ذلک کم من المصالح ما لا یخفی لاسیما فی ہذہ الایام التی قصرت ... ہمم جدا واشربت النفوس الہوی، واعجب کل ذی رای برایہ (حجۃ ج۱ ص۱۵۴)

شاہ صاحب ائمہ مذاہب اور دیگر فقہاء کی عظمت کے معترف ہیں۔ ان کے یہاں آج کل کے بعض مقلدوں جیسا تشدد نہیں ہے کہ وہ اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے کی عظمت کے معترف نہیں ہوتے۔ شاہ صاحب سب کو تسلیم کرتے ہیں اور اسی کی تلقین فرماتے ہیں۔ شاہ صاحب نے صاف صاف تحریر فرمایا ہے کہ اپنے امام کی افضلیت کا اعتقاد صحت تقلید کے لیے ضروری نہیں ہے اور دلیل یہ ہے کہ حضرات صحابہ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی افضلیت پر اتفاق کرتے تھے مگر ان کے پابند بہت سے مسائل میں وہ ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی بھی تقلید کرتے تھے اور اس پر کوئی نکیر نہیں کرتی تھی۔ الا یہ ان دونوں حضرات کے احترام میں کوئی فرق آتا تھا۔

ورد بان اعتقاد افضلیۃ الامام علی سائر الائمۃ غیر لازم فی صحۃ التقلید اجماعاً لان الصحابۃ والتابعین کانوا یعتقدون ان خیر ہذہ الامۃ ابوبکر ثم عمر وکانوا یقلدون فی کثیر من المسائل بخلاف قولہما ولم ینکر علی ذالک احد، وکان اجماع علی ما قلنا (عقد الجید ص۳۹)

اس تفصیل سے یہ بات تو واضح ہوئی کہ شاہ صاحب تقلید کو ناپسند نہیں فرماتے تھے بلکہ اس کے مؤید تھے اور دلائل کے ساتھ اس کی اہمیت و ضرورت محسوس فرماتے تھے لیکن یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ خود شاہ صاحب کا مسلک کیا تھا؟ اگر مقلد تھے تو حنفی تھے یا شافعی؟ ان سوالوں کے جوابات کے لیے ذرا تفصیل کی ضرورت ہے۔

اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ اسلامی قانون کے دو مراکز حجاز اور عراق کے نام سے مشہور ہیں۔ حجاز میں حضرت امام مالک نے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل مدینہ کے تعامل کو سامنے رکھ کر اسلامی قانون مرتب کیا اور اس فقہ کو اپنی کتاب مؤطا میں جمع کیا، حضرت امام شافعیؒ نے اسی فقہ کو وسعت دی۔ دونوں فقہوں کی تشکیل بھی حجاز میں ہوئی۔ نشوونما بھی یہیں پایا اور یہیں کے مزاج نے خاص قبول بھی کیا۔ مدینہ کے بعد عراق علم کا دوسرا بڑا مرکز تھا۔ فقہ حنفی کی ترتیب و تدوین عراق ہی میں ہوئی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دور خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو عراق روانہ کیا تھا۔ بعد میں ان کے کمال ... [illegible]

تک رہی ہے ۔ فقہ کی منزل کی یہ آل جو حنفی فقہ کہلاتا ہے ۔ حالانکہ اس دور میں ... عربی وہ مغربین کا مجموعہ تھا ۔ یونانی تہذیب اور عربی تہذیب ۔ زوال بغداد کے بعد عربی بولنے والوں نے مصر کا رخ کیا اور فارسی بولنے والے دہلی چلے آئے ۔ اس طرح ایرانیوں کے ساتھ حنفی فقہ بھی ہندوستان چلا آیا اور یہاں مذہب کے طور پر اختیار کر لیا گیا ۔

امام ابو حنیفہ کے ... شاگردوں ، امام محمدؒ ، اور امام ابو یوسف کی ... محنت سے اس فقہ کو زبردست فروغ ملا ۔ امام محمدؒ نے تصنیف تالیف اور درس و تدریس کے ذریعے اس کی اشاعت کی ۔ امام ابو یوسف ... حکومت کے قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے تو ان کے ذریعے اسے فروغ حاصل ہوا ۔ اس طرح ... فقہ میں ... کئی دور کی ایک ... خاص ... بھی پیدا ہو گئی ... صلاحیت ... حکومتوں کا سرکاری مذہب بن گئے ۔ ہندوستان میں ... اسلامی حکومت کے لیے یہ ایک قابل قبول قانون تھا ۔ بعد میں دو مرتبہ یہاں ... میں فقہ حنفی کی تدوین و ترتیب عمل میں آئی ۔ ایک مرتبہ عہد تغلقی میں ، سلطان محمد تغلق کے ایک امیر تاتار خان نے شیخ عالم بن علاء الدین کی خدمات اس کام کے لیے حاصل کیں ۔ فتاویٰ کی اس کتاب کا نام " فتاویٰ تاتار خانیہ " خود امیر تاتار خان سے منسوب ہے ۔ دوسری مرتبہ عہد عالمگیری میں سلطان اورنگزیب نے اس کام کی خاص طور پر نگرانی فرمائی ۔ اس مجلس میں جس کے سپرد یہ کام تھا وقت کے ممتاز علماء شامل تھے ۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے والد حضرت شاہ عبدالرحیمؒ بھی اس مجلس علمی کے رکن تھے ۔ سلاطین کی سرپرستی میں یہ مذہب ہندوستان میں فروغ پاتا رہا ۔ اسی دور میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہؒ کی پیدائش ہوئی ۔ اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے تعلیم حاصل کی ۔ خود بھی حنفی تھے اور اس وقت کے حنفی اکابر ... میں ایک خاص مقام رکھتے تھے ۔ بعد میں شاہ صاحبؒ نے اپنے وسعت مطالعہ ، دقت نظر اور بے پناہ صلاحیت کے بدولت اس میدان میں بھی اپنا نقش قائم کیا ۔ اپنے والد کی وفات کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ نے ان کا مدرسہ ... اور ان کے کام کو آگے بڑھایا ، یہ ۱۱۴۳ھ کی بات ہے ، بارہ سال تک درس و تدریس کی زندگی گزارنے کے بعد حرمین شریفین تشریف لے گئے ، وہاں کے مشہور اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ... اجازت حاصل کی ۔ حجاز میں ایک طرف آپ کے استاد شیخ ابو طاہر مدنی شافعی تھے تو دوسری جانب شیخ تاج الدین حنفی بھی تھے ۔ اس علمی صحبت نے شاہ صاحبؒ کے طرز فکر کو خاصا متاثر کیا اور فقہ حنفی کے ساتھ ساتھ فقہ شافعی کی اہمیت بھی وہ محسوس کرنے لگے ۔ حجاز میں قیام کے دوران شاہ صاحبؒ کا یہ خیال رہا کہ صحاح ستہ کی اصل موطا امام مالک ہے ۔ اور موطا احادیث کا صحیح ترین مجموعہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے قریب ترین ہے ۔ اس لیے صحاح ستہ کی بنیاد پر اگر کوئی عالم فتویٰ دے تو وہ فتویٰ قابل ترجیح ہوگا خواہ وہ عالم حنفی ہو یا شافعی ۔ حجاز کے قیام نے شاہ صاحبؒ کے دل میں یہ بات بھی ڈال دی کہ یہ فقہ اپنے علاقے کا مزاج رکھتا ہے ۔ حنفی فقہ کا مزاج حجاز میں نہیں ہے ۔ وہاں کے بڑے بڑے اہل علم حضرات فقہ شافعی کے پابند نظر آتے ہیں ۔ اسی بنیاد پر شاہ صاحبؒ نے دونوں فقہوں کی یکسانیت اور اتحاد پر زور دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ موطا کو حدیث کی تمام کتابوں اور فقہوں کی اصل قرار دیا جائے ۔ اپنی اس تحریک کا مرکز شاہ صاحبؒ نے حجاز مقدس کو قرار دیا ۔ مگر وہاں یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی اور آپ کو دہلی واپس چلے آنے کا حکم دیا گیا ۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی کتابوں میں ایک تاریخی خواب درج کیا ہے جس میں آنحضرت صلی ... اس کے ... کی ... موجود ہے ۔ اسی خواب میں آپ کو حکم ... تھا ، ہندوستان واپس تشریف لائے تو آپ کے خیالات میں ... تھی ۔ ... کی تفصیل مولانا عبید اللہ سندھی کی کتاب ... ولی اللہ اور ان کا ... شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ... میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔

شاہ صاحبؒ ... خیال تھا ... علاقوں میں یہاں ... باتیں ... بہت ... کی تقلید ... موجود ہوں اور ... کے مسائل ... عام لوگوں کے لیے ... فقہ کا ... ہے ... اس کے دائرے سے باہر نکلنا ان کے لیے جائز نہیں ہے

" الانصاف " میں ... ہیں :

فاذا كان الانسان جاهلاً فى بلاد الهند ... وبلاد ما وراء النهر ! وليس هناك عالم شافعى ولا مالكى ولا حنبلى ، ولا كتاب من كتب المذاهب وجب عليه ان يقلد بمذهب ابى حنيفة ويحرم عليه ان يخرج من مذهبه لانه حينئذ يخلع عنقه ربقة الشريعة ويبقى اسدا مهملا ۔

(صفحہ ۱۷)

حجاز سے واپسی کے بعد شاہ صاحبؒ نے اپنی خیالات کا اظہار فرمایا ، عام لوگوں کے لیے تقلید کو تو وہ پہلے ہی ضروری خیال فرماتے تھے ، ہندوستان واپس ... تقلید ... حنفی ... اس کی وجہ جیسا کہ فیوض الحرمین میں لکھا ہے یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ صاحبؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ ان مذاہب کی تقلید کی جائے اور ان کے دائرے سے باہر نہ نکلا جائے ۔

استفدت منہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثۃ امور خلاف ما کان عندی، وما کان طبعی یمیل الیہ اشد میل. فصارت ھذہ الاستفادۃ من براھین الحق علی. احدھا الوصاۃ بترک الالتفات الی التسبب وثانیھا الوصاۃ بالتقلید ھذہ المذاھب الاربع لا اخرج منھا. والتوفیق ما استطعت، وجبلتی تأبی التقلید، وتأنف منہ راساً، ولکن شئ طلب منی التعبد بہ بخلاف نفسی، وھنا نکتۃ طویت ذکرھا، وقد تفطنت بحمد اللہ بسر ھذہ الحیلۃ وھذہ الوصاۃ (ص ۶۴ شہد سی و دوم)

اس عبارت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحبؒ فقہ میں مہارت ادراک اور اسلامی علوم پر اتنی قدرت حاصل کر چکے تھے کہ تقلید سے انھیں طبعی طور پر کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مگر امر تعبدی کی تعمیل میں شاہ صاحبؒ نے تقلید اختیار فرمائی۔

اسی طرح ایک الہام شاہ صاحبؒ کو یہ بھی ہوا کہ حق کا منشا تجھ سے یہ ہے کہ امت مرحومہ کی تنظیم اور اس کی شیرازہ بندی کے لیے کوشاں ہو اور فروعات میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کرے۔

ونفخ فی نفخۃ اخری فبین ان مراد الحق فیک ان یجمع شملا من الامۃ المرحومۃ بک وایاک ان تخالف القوم فی الفروع فانہ مناقضۃ لمراد الحق (فیوض الحرمین ص ۶۲)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کو ہندوستان میں دینی تجدید کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہندوستان ہمیشہ سے فقہ حنفی کا پابند رہا ہے۔ سرکاری طور پر فقہ حنفی کی نئی ترتیب و تدوین عمل میں آئی۔ یہی فقہ حکومت کے منظور کا قانون تھا۔ ان حالات میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شاہ صاحبؒ اس فقہ کی مخالفت فرمائیں گے اور اپنے لیے کوئی ایسا راستہ تلاش کریں گے جو قوم کی راہ سے جدا ہو جیسا کہ شاہ صاحب کی مختلف تحریروں میں فقہ حنفی کی اہمیت اور تمام فقہوں پر اس کی فضیلت پر تفصیل بیان کیا گیا۔ چنانچہ فیوض الحرمین میں ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حنفی فقہ میں ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جو دوسرے طریقوں کی بہ نسبت اس سنت کے زیادہ مطابق ہے جس کی تدوین و تنقیح امام بخاری اور ان کے ساتھیوں کے زمانے میں ہوئی

عرفنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فی المذھب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق الطرق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت ونقحت فی زمان البخاری واصحابہ (ص ۴۸)

مذہب حنفی اختیار کر لینے کے بعد بھی شاہ صاحب کی نظر میں

فقہ شافعی کی عظمت ختم نہیں ہوئی بلکہ درسی طور پر آپ شافعی اور حنفی مذہب میں تطبیق کا کام کرتے رہے۔ البتہ عملی طور پر آپ نے امام ابو حنیفہ کی تقلید لازم قرار دی تھی۔ چنانچہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں بخاری شریف کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جس کے ٹائیٹل پر شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک عزیز شاگرد مولانا محمد فراغ محمد کو اجازت حدیث سے نوازا ہے۔ وہاں یہ الفاظ بھی ہیں مذہبا شافعی و حنفی عملاً و تدریسا کتاب پر آپ کے صاحب زادے مولانا شاہ رفیع الدینؒ کے دستخط بھی ثبت ہیں اور شاہ عالم کی مہر تصدیق بھی "الفرقان" کے ولی اللہ نمبر میں اس کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔

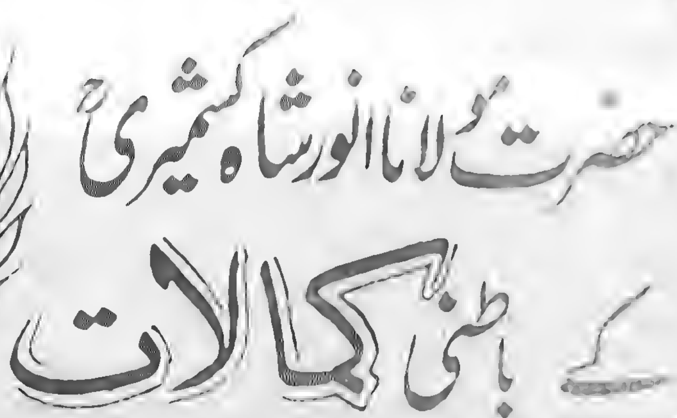
حضرت شاہ صاحبؒ کی تقلید میں عام علماء سے مختلف تھے ان کا اس سلسلے میں ایک مخصوص طریقہ تھا۔ وہ نری اور جامد محض تقلید کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ جو کچھ اختیار فرماتے علی وجہ البصیرۃ اختیار فرماتے اور اسے کتاب و سنت کی کسوٹی پر جانچ لیا کرتے تھے

حنفی فقہ کا اسلوب اس قدر وسیع ہے کہ دوسرے فقہی مکاتب کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے اپنے مقالہ میں مولانا زین العابدین بن قاسم قطلوبغا کے تاج التراجم (قلمی نسخہ) سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مشہور فقیہ کاسانی حنفی تشریف لے گئے، ان کی خدمت میں بہتیرے فقہاء حاضر ہوئے اور بہت سے مسائل کے سلسلے میں استفسار کیا جب بھی کوئی مسئلہ پیش ہوتا کاسانی فرماتے کہ اس مسئلے میں ہمارے فلاں امام کی رائے یہ ہے اور اس میں فلاں امام کی رائے یہ ہے، مراد ان کی کبھی ابو یوسف سے ہوتی کبھی محمد سے اور کبھی ابو حنیفہ سے۔ بعینہ یہی رائے فقہ حنفی کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تھی، ان کا خیال تھا کہ ان تینوں آئمہ میں سے کسی نہ کسی کے یہاں ہر مسئلے میں کوئی نہ کوئی قول ایسا مل جاتا ہے جو سنت کے زیادہ قریب ہو۔ فرماتے ہیں

وذلک ان یوخذ من اقوال الثلثۃ قول اقربھم بھا فی المسئلۃ، ثم بعد ذالک یتبع اختیارات الفقھاء الحنفیین الذین کانوا من علماء الحدیث فرب شئ سکت عنہ الثلثۃ فی الاصول وما تعرضوا لنفیہ ودلت الاحادیث علیہ فلیس بد من اثباتہ والکل مذھب حنفی (فیوض الحرمین ص ۴۸)

اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ کے ہاں مشروط اجتہاد کی گنجائش بھی تھی، بلکہ ضرورت کے موقع پر اجتہاد پر اصرار بھی تھا۔ موطا امام مالک کی شرح مصفی میں یہ بحث وضاحت سے تحریر فرمائی ہے مولانا حبیب ... کے الفاظ میں شاہ صاحب کی بحث کا خلاصہ

(باقی ....)



سید محمد فاروق بخاری
لیکچرر شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج
سوپور

از: سید محمد فاروق بخاری لیکچرر شعبۂ عربی گورنمنٹ کالج سوپور

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی حیات اگرچہ اہل علم پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور تقریباً قریب ان کی حیات سے … پہلو … گئی ہے مگر ان کے باطنی فیض اور روحانی کمالات قریب قریب سارے کے سارے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں۔ حالانکہ یہ حصہ بھی پوری توجہ کا مستحق ہے۔ ایسا یہ حضرت کے اس طرح … ظاہری علمی اور اصلاحی … ان کی تصنیفات میں … زیادہ … کی ضرورت باقی نہیں ہوتی ہے۔ اس طرح ان کے روحانی کمالات عیاں نہیں ہیں … اپنے آپ کو چھپانے … کہ حضرت جیسا شخص … والوں کا … کہ وہ کسی طرح بھی … کے سامنے آنا نہ چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ گوشۂ گمنامی میں رہنا چاہتے تھے۔ … ان کی شادی اس وقت ہوئی جب عمر ۴۰ سال … تھی۔ اسی بنا پر وہ درس و تدریس سے بھی … اور مدینہ منورہ کی طرف دائمی ہجرت کے … تصنیف و تالیف سے بھی حتی الامکان گریز کیا کرتے تھے … جو … ہوتا تو

… اسلام ہم دیکھ سکتے … "تحفۃ الاسلام" … دیکھئے … "اکفار الملحدین" جو اپنے موضوع میں حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ … فقہی مسائل بیان کئے چند رسالوں کے علاوہ بھی … احناف کے … علاوہ ان کے … ان کا علمی مرتبہ روشن کرنے میں معاون ثابت ہوئے ان کے تلامذۂ کرام جیسے مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد … مولانا محمد … نجیب آبادی نے دوران درس قلمبند کئے ہیں … کا مقصد ہے کہ علامہ محدث کشمیری ہر حیثیت سے اپنے آپ کو چھپانا چاہتے تھے جو کہ … اس لئے … کو چھپانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ مگر جہاں تک باطنی کمالات کا تعلق ہے یہاں وہ اپنے مقصد میں ۹۹ فیصد کامیاب ہوئے اگر یہاں بھی کامیاب نہ ہوتے تو ان کے … شاگرد اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی حضرت شاہ صاحبؒ کے "دست راست" مولانا محمد انوری لائلپوری کا کہنا ہے کہ "لاکھوں مریدین کا ہجوم آپ کو گھیرے رہتا"[1]۔

حضرت محدث کشمیری کو عام طور پر مولانا مناظر احسن گیلانی …

---

[1] انوار الباری مقدمہ حصہ ۲ ص ۲۴۳

کی "امام الفقہاء والمحدثین" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہ بہت کچھ تھے۔ اس کے لیے ہماری زیر تالیف کتاب "محدث کشمیری اور ان کے فضائل و کمالات" کا انتظار کرنا چاہیے۔ فی الحال زیر بحث موضوع کے بارے میں چند سطور ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

حضرت علامہ انور شاہ محدثؒ روحانیت میں عظیم الشان کمالات کے مالک تھے۔ ان کا خاندان سینکڑوں سالوں سے زہد و تقویٰ کا گھرانہ ہے۔ خود حضرت شاہ صاحب وقت کے جلیل الشان شیوخ سے خود بعیت تھے۔ حکیمانہ نگاہیں جانتی تھیں کہ موصوف صرف علوم عربیہ دینیہ کے فاضل ہی نہیں ہیں۔ بلکہ روحانی میدان کے شہسوار بھی ہیں۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان دس پندرہ شیوخ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا اسم گرامی بھی گنا ہے۔ جنہیں وہ شیخ اور مُربی بننے کا اہل سمجھتے تھے[۱] ان کے علاوہ ان کی صحبت سے ان کے ایسے تلامذہ بھی پیدا ہوئے جو بعد میں شیوخ وقت کہلائے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ انہی کے شاگرد تھے۔

حضرت محدث کشمیریؒ تصوف اور روحانیت کے صرف عامل ہی نہ تھے۔ بلکہ اس موضوع پر جتنی اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ سب ان کی نظر میں تھیں بالخصوص شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تصنیفات خاص کر فتوحاتِ مکیہ، فصوص الحکم، الانسان الکامل کے گویا حافظ نظر آتے ہیں۔ معتمد علماء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جس طرح مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم کے خاص محقق تھے اسی طرح حضرت محدث کشمیری شیخ اکبر کے علوم کے غواص تھے۔ مولانا محمد منظور نعمانی کہتے ہیں کہ مرحوم خود وقت کے شیخ اکبرؒ تھے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں:

کان کثیرالاعجاب بالشیخ محی الدین ابن عربی فی بیان الحقائق والمعارف الالٰہیۃ[۲]

اسی وجہ سے آپ ان کے امالی اور تصانیف میں دیکھ سکتے ہیں۔ کہ قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح میں جہاں چوٹی کے مفسرین اور محدثین کے اقوال پے در پے نقل کرتے ہیں وہاں شیخ اکبر کے آراء اور افادات بھی سناتے ہیں۔ اس چیز نے حضرت شاہ صاحب کو الفاظ میں مقید کرنے سے بچایا تھا۔ بلکہ بعض اوقات بڑے نشاط کے ساتھ کہتے ہیں:-

کن علی بصیرۃ من ربک حتی یتضح لک الحق الصراح من الظنون والاوھام الفاسدۃ ولا تکن محبوساً فی سجن الالفاظ ودوائر الامثلۃ وارتق منھا الی المقصود الذی یضیق عنہ نطاق البیان[۳]

"یعنی اپنے رب کی بصیرت پر قائم رہ یہاں تک کہ ظنون باطلہ اور اوہام فاسدہ سے حق صریح آشکارا ہو جائے الفاظ اور خود ساختہ مثالوں کی زنجیروں سے نکل کر اس مقصود و مطلوب کی طرف ترقی کر جس کے بیان سے زبان و الفاظ تنگ اور ناقص ہیں۔"

وہ حقائق اور معارف بیان کرتے ہیں صحیح تصوف اور جدید سائنسی ترقی میں اتفاق پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے دیکھئے

---

[۱] حکیم الامۃ: نقوش مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی۔

[۱] حیات انور مقالہ حضرت مولانا نعمانی [۲] نزہۃ الخواطر۔ مولانا ندوی نے تصریح فرمائی ہے۔ کہ خطوط وحدانی میں ان کی اپنی عبارت ہے نہ کہ مصنف کتاب حضرت مولانا عبدالحئی صاحب کی۔

[۳] انوار المحمود شرح ابو داؤد ج۲ ص۵۵۰

والا حیران ہو جاتا ہے جب وہ ان کی زبان سے سنتا ہے کہ یونانی فرسودہ فلسفہ کے مقابلے میں جدید تحقیقات و انکشافات اسلام کے ساتھ زیادہ ربط رکھتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال سے یک بار کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات آج کی سائنسی ترقی کے لیے بطورِ مقدمات تھے بلکہ انھیں مادی میدان سے زیادہ روحانی میدان وسیع نظر آتا ہے۔ ایک بار جب بارہ مولا کشمیر کے مقام پر جہلم کی کھدائی کے لیے پہلی بار کھدائی کی مشین لائی گئی تو لوگ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق آتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کسی اہم کام کے لیے کشمیر وارد ہوئے تھے اور بارہ مولا میں قیام تھا۔ میزبانوں نے ایک بار شاہ صاحبؒ کو بھی یہ نئی مشین ملاحظہ کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے مان لیا۔ وہاں پہنچنے پر شاہ صاحبؒ نے مشین ڈرائیور کے ساتھ جو ایک تجربہ کار انجینئر تھا، کافی دیر تک بات چیت کی اور ایک ایک پرزے کے بارے میں پوچھا جب واپس ہونے لگے تو ڈرائیور نے لوگوں سے کہا کہ یہ شخص بڑا ماہر انجینئر معلوم ہوتا ہے جب اس بات کا تذکرہ شاہ صاحبؒ کے سامنے کیا گیا تو انھوں نے فرمایا۔ یہ مادی [illegible] ہے اگر مجھے یہ سامان مہیا ہو جائے تو میں اس سے زیادہ اچھی بنا سکتا ہوں۔ تحقیقات جدیدہ اور عرفاءِ اسلام کے علوم و تفردات کو جس طرح انھوں نے ملانے کی کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرے محدود مطالعہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جس طرح ڈاکٹر فرید وجدی اور بستانی کی دائرۃ [illegible] علامہ شبلی نعمانی کو چھوڑ کر کوئی اور [illegible] نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ علامہ طنطاوی جوہری اور علامہ توفیق صدفی کے حوالے بھی ان کے ہاں ملتے ہیں۔ غرض حقائق و معارف بیان کرنے میں انھیں اس قدر تبحر حاصل تھا کہ بعض اوقات ابنِ سینا اور ابنِ رشد کے [illegible] نے جائز تنقید فرمائی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کو مذکورہ بالا علوم پر مکمل درک ہی حاصل نہ تھا بلکہ وہ ایک تجربہ کار عارف باللہ اور روحانیت کے مردِ میدان بھی تھے۔ اگر انھیں اخفاءِ حال کی طرف سخت توجہ نہ ہوتی تو جنیدؒ و شبلیؒ کی یاد تازہ ہو جاتی پھر بھی لوگوں نے کئی بار ان سے ایسی چیزیں دیکھیں کہ حیران اور ششدر ہوئے

کشمیر کا واقعہ ہے۔ ایک بار حضرت شاہ صاحبؒ کشمیر وارد ہوئے۔ سوپور میں "اچھبل" گاؤں میں قیام تھا۔ یہاں ایک بزرگ اسد ملک نامی حضرتؒ کے مخلص خادم اور فدائی تھے ہروقت ساتھ ہوتے تھے۔ انھی مرحوم اسد کا بیان ہے کہ ایک بار حضرت شاہ صاحبؒ درمیانی رات میں چپکے سے نکلے۔ میں بڑی خاموشی کے ساتھ پیچھے پیچھے چلا، اندازہ ہوا کہ تہجد کی غرض سے اُٹھے ہیں اور اب وضو کرنے کے لیے ندی پر جا رہے ہیں۔ اسد ملک کا بیان ہے کہ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ رات کی تاریکی میں دو روشن قندیلیں شاہ صاحبؒ کے دائیں اور بائیں ہیں اور شاہ صاحبؒ انھی کی روشنی میں دریا کی طرف جا رہے ہیں میں حد سے زیادہ کوشش کرتا کہ شاہ صاحبؒ کسی طرح میرے پیچھے چلنے سے آگاہ نہ ہو جائیں مگر فوراً اسد [illegible] لگے۔ میں نے عرض کیا: حضرت!

تو آپ نے فرمایا جاؤ، سو جاؤ کہیں ڈر جاؤ گے۔ مرحوم اسد ملک فرماتے ہیں، میں تاریکی میں واپس لوٹا حیرانی اور پریشانی کی حالت رات بھر طاری رہی۔ صبح میں نے یہ کیفیت صاف صاف اور بے جھجک عرض کی تو یہ جواب دے کر ٹال گئے "تم ڈر گئے ہو۔"

اسی کے ساتھ ملتا جلتا مولانا محمد انوری صاحب لائلپوری کا یہ بیان ہے "انہی ایام میں (بہاول پور کے مشہور تاریخی سفر میں) اس قدر حضرتؒ کے چہرۂ مبارک پر انوار کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بار ہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں۔ حالانکہ اس وقت بجلی گل ہوتی تھی"[1]

مثنوی مولانا رومی اور مکتوبات مجدد الف ثانی سمجھنے والے بحمداللہ اب بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور بہت خوب سمجھتے اور سمجھاتے ہیں مگر اسے جذب کرنا اور اپنی عملی زندگی میں اسے طبیعتِ ثانیہ بنانا دوسری بات ہے۔ شاید اسی وجہ سے اقبالیات کے معروف شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے شرح ارمغان حجاز میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے بعد ان دونوں کتابوں کو سمجھنے والے مشکل سے ملیں گے۔ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جو ایک بار بارہ مولا میں پیش آیا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ دیوبند سے کشمیر تشریف لائے تھے۔ بارہ مولا کے آس پاس ایک گاؤں میں کسی خادم کے گھر میں قیام تھا۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ حضرت مرحوم جب تشریف لاتے تھے ہزاروں عوام کے علاوہ بڑے بڑے شیوخ اور اعاظم رجال بھی فرشِ راہ ہوتے تھے۔

سری نگر کی ایک نامی شخصیت جو خلوص وللہیت اور تقویٰ و طہارت میں مانے ہوئے تھے یعنی مرحوم و مغفور مولانا محمد فاضل منطقی بھی ان دنوں کسی وجہ سے بارہ مولا میں تھے۔ فاضل صاحب مرحوم ایک زمانے میں انجمن تبلیغ الاسلام کے صدر اور مدینۃ العلوم کاشیپورہ کے سرپرست بھی تھے۔ انھوں نے ایک واقعہ والد محترم مولانا سید قاسم شاہ بخاری سے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اسی دورہ کے دوران ایک دن حضرت مولانا انور شاہ گاؤں کی مسجد میں نماز فجر پڑھنے تشریف لائے۔ مسجد بھری تھی اور میں (فاضل صاحب مرحوم) پہلی صف میں تھا۔ نماز حضرت راس المحدثین ہی نے پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد اوراد با جماعت شروع ہوا۔ اسی دوران حضرت شاہ صاحبؒ نے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کی طرف اشارہ کیا۔ میں حکم کی تعمیل بجا لایا، میں نے اپنے بائیں طرف دیکھا تو اچانک نورانی شکل و صورت کے ایک آدمی کو پایا جو سبز لباس (شاید چوغہ) میں ملبوس تھا اور سر پر رومی ٹوپی تھی میں ڈر گیا اور سر کو نیچے کر لیا اس ڈر کی وجہ سے مجھ پر رقت اور رونے کا اتنا غلبہ ہوا کہ شاہ صاحبؒ کو متوجہ ہونا پڑا، میری یہ حالت دیکھ کر پوچھنے لگے "کیا ہوا؟"

میں نے اپنے بائیں طرف دیکھا تو یہ شخص غائب۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی ایسی ایسی شکل و صورت کا آدمی یہاں بیٹھا تھا اور اب غائب ہو گیا۔ تو فرمانے لگے "شاید مولانا رومی می باشند"۔

حضرت شاہ صاحبؒ دولتِ عرفان سے مالا مال تھے فیض الباری کی ہر چہار جلدوں اور انوار المحمود جلد دوم کے آخری اوراق ملاحظہ کرنے کے قابل ہیں جن میں حقیقتِ نبوت یا وحدۃ الوجود، حقیقتِ روح، حقیقتِ جنت و جہنم، تجسّدِ اعمال، مسئلہ جبر و اختیار، مسئلہ کسب پر ان کے افادات موجود ہیں۔ جہاں وہ شیخ اکبر امام غزالی وغیرہ کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وہ ساتھ ہی تنبیہاً یہ بھی کہتے ہیں کہ ان لوگوں سے ہرگز مخاطب نہیں ہوں جن کا فہم ناقص ہے۔ انھیں چاہیے کہ ایسی باتوں میں نہ الجھ جائیں، وہ خواہ مخواہ میری طرف ایسی باتیں منسوب کریں گے جنھیں میرے مدعا کے ساتھ کوئی ربط

---

[1] فیض الباری ج ۳ ص ۳۰۴

ہو گا۔

ومن لا يقدر على وضع	جنھیں باتوں کو اپنی اپنی
الاشياء في مواضعها	جگہ پر رکھنے کی صلاحیت
فليس خطابي معه	نہ ہو بیان سے مخاطب
ولا احل له ان يقنبها	نہیں ہوں۔ ان کے لیے
ليس له به علم، وانما	یہ بھی جائز نہیں ہے کہ
خلق الله لكل فن	اس چیز کو کریدنے بیٹھیں جن
رجال	سے وہ ناواقف ہوں۔

"لِکُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ"

ایک بار لاہور سے کشمیر وارد ہوئے تو سری نگر ہی میں اندرابی منزل میں قیام کیا۔ اندرون اور بیرون کشمیر کے نامور فاضل مولانا میرک شاہ اندرابی سابق پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور بھی تھے جو حضرت شاہ صاحبؒ کے ممتاز شاگردوں میں سے بھی تھے۔ اس قیام سے تھوڑے فاصلے (تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر) پر مشہور ولی اور بزرگ حضرت حمزہؒ کا مزار پُر انوار ہے۔ ان کے اہل کشمیر پر متعدد احسانات ہیں جن میں سے اہم یہ ہے کہ انھی کی مساعی جمیلہ سے وہ تاریخی آگ کشمیر میں بجھ گئی جو یہاں شیعہ دورِ حکومت میں ارباب حکومت کے ذریعہ اہل سنت والجماعت کے خلاف ایک سرے سے کہ دوسرے سرے تک لگی تھی۔ غرض حضرت شاہ صاحبؒ نے یہاں فاتحہ پڑھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ حاضرین کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ چل کھڑے ہوئے ابھی منزلِ مقصود بہت دُور تھی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جگہ پہاڑ پر واقع ہے جس پر پہنچنے کے لیے سیڑھیوں کا ایک لمبا چوڑا سلسلہ ہے جو ڈیڑھ سو زینوں سے کم نہیں ہیں، مگر حضرت شاہ صاحبؒ نے جوتیاں نکالیں اور جلدی جلدی چلنے لگے۔ خدا کا جو مجمع ان کے ساتھ تھا وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا مگر کوئی کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ بالآخر مولانا میرک شاہ اندرابی سے نہ رہا گیا اور انھوں نے کہا "حضرت ابھی بازار ہی ہے پھر باہر کا صحن ہو گا تب سیڑھیوں کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ مولانا اندرابی کا یہ کہنے سے جو مقصد تھا حضرت شاہ صاحبؒ وہ سمجھ گئے۔ تو انھوں نے اندرابی صاحب کی ساری باتوں کا جواب جس ایک جملے میں دیا وہ یہ ہے "آپ کو تو نظر نہیں آتا مجھے تو نظر آتا ہے۔"

ایک بار اندرابی منزل ہی میں قیام تھا۔ نماز پڑھنے نکلے تو مسجد کی اوّل صف سے گزرتے ہوئے دیوار کے قریب کھڑے ہوئے اور فاتحہ پڑھی۔ فارغ ہونے کے بعد ایک بزرگ سے پوچھا اس دیوار کے نیچے کسی بزرگ کی قبر تو نہیں ہے؟ تو انھوں نے کہا، جی ہاں! یہاں حضرت میر میرک اندرابی رحمۃ اللہ علیہ مدفون ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا "ان کی روح نے مجھے اپنی طرف سخت کشش کی۔"

میں اس مضمون کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے جامع الفاظ پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کے زہد و تقویٰ اور اخلاص و للّٰہیت کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

تغشاعليه السكينة، ويعلوه	سکون ان پر چھایا اور وقار طاری
الوقار، خافت الصوت، لا يتكلم	تھا۔ آواز دھیمی تھی، وہی باتیں
الا فيما يعنيه، وفيما يتصل	بولتے جن میں معنویت ہوتی تھی اور
بالعلم والدين، مجالسه مجالس	علم اور دین کے ساتھ تعلق رکھتی
علمٍ وافادةٍ، وقد غلبته	تھیں، ان کی مجلسیں علم و افادہ کی
الرقة في اخر حياته فكان	مجلسیں ہوتی تھیں۔ آخر میں رقت
سريع الدمعة كثير	کا ان پر غلبہ ہوا تھا۔ کثرت
البكاء وغلبه شغف	سے روتے اور آنسو بہاتے تھے۔
بالحقائق الالهية و	حقائق الٰہیہ اور علوم دقیقہ کے ساتھ
العلوم الدقيقة	شدید دلچسپی پیدا ہو گئی تھی

دونوں عالم تجھ سے مرے حرفِ دعا میں غرق و محو

دل نثارِ مصطفیٰؐ جاں پائمالِ مصطفیٰؐ

یہ اویسِؓ مصطفیٰؐ ہے وہ بلالِؓ مصطفیٰؐ

دونوں عالم تجھ سے مرے حرفِ دعا میں غرق و محو

مَیں خدا سے کر رہا تھا جب سوالِ مصطفیٰؐ

سب سمجھتے ہیں اسے شمعِ شبستانِ حرا

نور ہے کونین کا لیکن جمالِ مصطفیٰؐ

عالمِ ناسوت میں اور عالمِ لاہوت میں

کوندتی ہے ہر طرف برقِ جمالِ مصطفیٰؐ

عظمتِ تنزیہہ دیکھی شوکتِ تشبیہ بھی !

ایک حالِ مصطفیٰؐ ہے ایک قالِ مصطفیٰؐ

ذرّہ ذرّہ عالمِ ہستی کا روشن ہو گیا

اللہ اللہ! شوکت و شانِ جمالِ مصطفیٰؐ

ٹیلیفون نمبر ۶۷۵۳۵

ہفت روزہ **خدام الدین** لاہور

رجسٹرڈ ایل نمبر ۶۰۷۳

منظور شدہ ۱- لاہور بورڈ بذریعہ چٹھی نمبری ۹۱۳۳۲۱ مورخہ ۳ مئی ۱۹۵۶ء (۲) پشاور بورڈ بذریعہ چٹھی نمبری T.B.C ۲۲۴۸۱-۲۲۶ مورخہ ۷ ستمبر ۱۹۵۶ء
محکمہ تعلیم ۳- کوئٹہ بورڈ بذریعہ چٹھی نمبری ۹/۳۹/۲۰۷۶۶-۹ DDA مورخہ ۲ اگست ۱۹۶۴ء (۴) راولپنڈی بورڈ بذریعہ میمو G.M/۳۰-۵۲۱۰ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء

بقیہ : شاہ ولی اللہؒ

ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں اجتہاد فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن یہاں اجتہاد سے مقصود اجتہاد مستقل نہیں ہے جیسا کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہر زمانے میں اجتہاد فرض ہے، اس کا دراصل مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسائل آئے دن نئے سے نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ان کے بارے میں احکام الٰہی کا جاننا ضروری ہے اور جو کچھ پہلے مدون اور مرتب ہو چکا ہے وہ کافی نہیں ہے۔ پھر اس میں بھی بہت اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک دلائل کی طرف رجوع نہ کیا جائے اور ان دلائل کا سلسلہ مجتہدین تک لے جایا نہیں جا سکتا۔ ان حالات میں ان کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی کہ مسائل کو اجتہاد کے اصولوں پر رکھا جائے۔

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ضمیمہ صفحہ ۱۷۴)

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ کا سلسلہ اور خود ان کے چاروں جلیل القدر صاحبزادے حنفی ہیں۔ مولانا عاشق پھلتی جو شاہ صاحبؒ کے عزیز ترین شاگرد بھی ہیں اور قریبی عزیز بھی خود فقہ حنفی کے پیرو ہیں اور شاہ عبد العزیزؒ کے اس مضمون میں استاذ بھی، حضرت شاہ عبد العزیزؒ کی "عجالہ نافعہ" دیکھی جائے تو حنفی فقہ کے بارے میں ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ عبد العزیزؒ اپنے والد کی زبان ہیں۔ خیالات سب انہی سے لیتے ہیں، شاہ عبد العزیزؒ سے ولی اللہی علوم شاہ اسحاق دہلویؒ کو ملے، ان کے ذریعہ شاہ عبد الغنی مجددیؒ مولانا مملوک علیؒ اور مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ تک پہنچے۔ ان حضرات سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اکتساب فیض کیا۔ جو کام شاہ عبد العزیزؒ اور ان کے لائق بھتیجے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے شروع کیا تھا اسی کام کو ان حضرات نے دیوبند میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھ کر آگے بڑھایا۔ ولی اللہی فکر کی اشاعت اس مدرسہ کا مقصد رہا۔ زیادہ دیر نہیں گزری کہ اس اسکول سے بہت سے باکمال لوگ باہر آئے۔ یہ پورا سلسلہ المذہب حنفی ہے اور شاہ صاحب کے افکار کا پورا پورا پابند بھی۔

آخر میں نواب صدیق حسن خان کی شہادت پیش کر دینا کافی ہوگی۔ مولانا صدیق حسن خان ہندوستان میں غیر مقلدوں کے امام اور پیشوا خیال کیے جاتے ہیں اس لیے شاہ صاحبؒ اور ان کے ممتاز خاندان کے حق میں ان کی شہادت کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے سیاسی تحریک کے ضمیمے میں نواب صدیق حسن خان کی کتاب الحطۃ کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ امام ولی اللہ دہلوی کا مسلک یہ ہے کہ وہ زیر بحث مسائل کو اول تو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، پھر ان کے متعلق فقہاء کے جو اقوال اور آراء ہیں ان کو کتاب و سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں، جو فقہی اقوال ان دونوں پر پورے اترتے ہیں انہیں تو قبول کر لیتے ہیں اور جو ان کے خلاف نظر آئیں انہیں رد کر دیتے ہیں اور اس معاملے میں وہ کسی کی پروا نہیں کرتے، یہی کیفیت ان کے پوتے مولانا اسماعیل شہید کی ہے۔ موصوف نے اپنے جد امجد کے اسی طریقہ پر پیروی کی۔ اور خدانخواستہ جیسا کہ جاہل سمجھتے ہیں آپ نے اسلام میں کوئی نئی بات اپنی طرف سے جاری نہیں کی۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ کا یہ طریقہ حنفی فقہ کے خلاف نہ تھا اور یہی وہ شاہراہ شریعت ہے جس پر اسلاف اور ان کے بعد والے چلتے رہے۔ یہ گھرانہ حنفی فقہ کا متبع اور پاک نفوس کا حامل تھا۔

مولانا عبید اللہ انور پبلشر نے پرنٹر خواجہ شوکت علی پرنٹنگ پریس ... میں چھپوا کر شیرانوالہ گیٹ لاہور سے شائع کیا